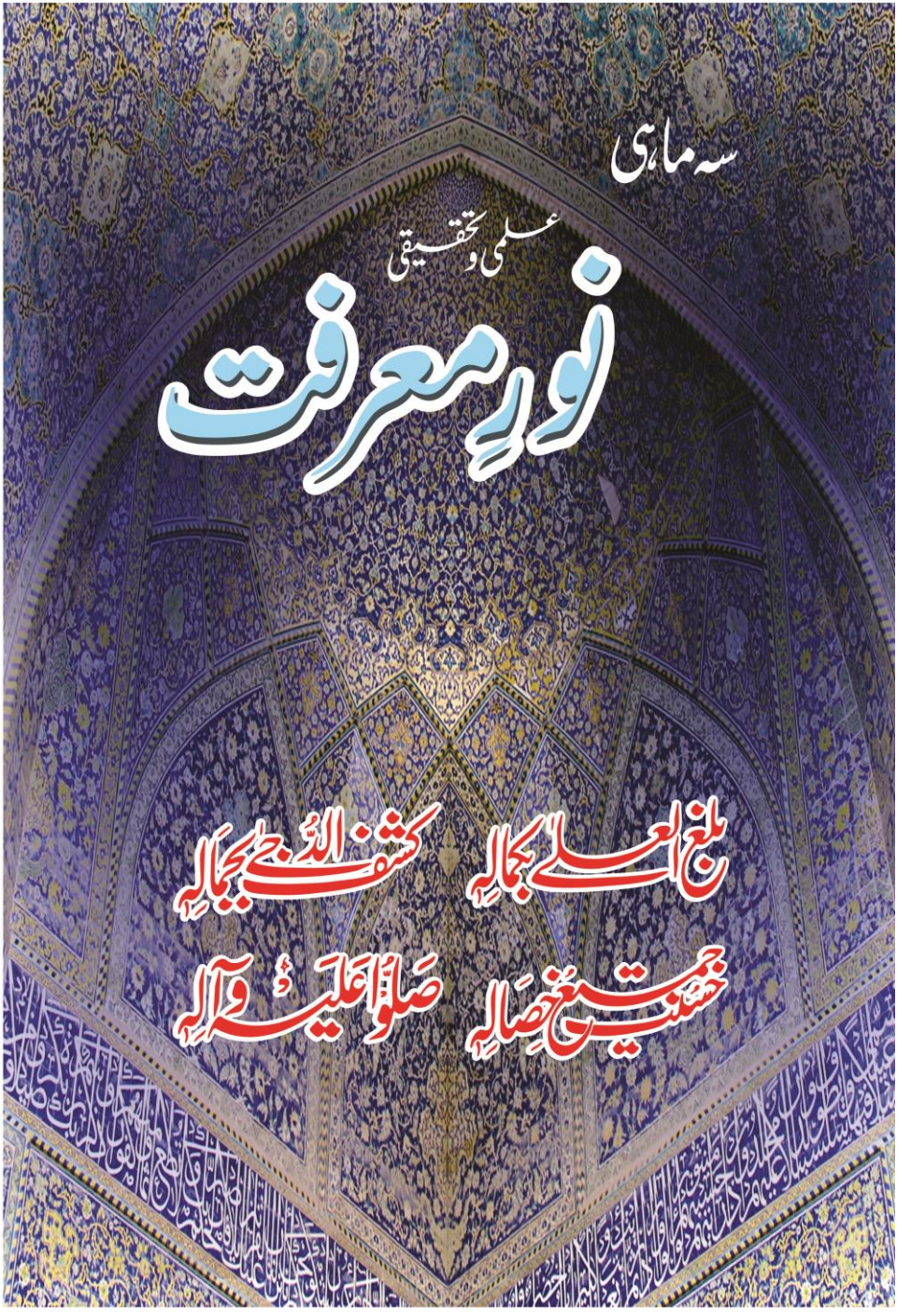
سہ ماہی
علمی و تحقیقی
نورِ معرفت
بلغ العلیٰ بکمالہٖ
کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ
صلوا علیہ وآلہٖ

بسم الله الرحمن الرحيم

اہم گذارشات

☆ مقالہ نگار حضرات سے درخواست ہے کہ اپنے تحقیقی مقالات مدیرِ مجلّہ کے نام ارسال کریں۔

☆ بہتر ہے مضمون کمپوز شدہ ہوں اور ان کی ضخامت بیس/پچیس صفحات سے زائد نہ ہو۔
ممکن ہو تو مضمون کی سافٹ کاپی بھی ارسال کریں یا مدیرِ مجلّہ کو ای۔ میل کی جائے۔

☆ ممکن ہے ادارہ ہر شمارے کے لیے محققین کو اپنی طرف سے جدید تحقیق طلب موضوعات ارسال کرے۔ اس صورت میں دیے گئے موضوعات پر تحقیقات ارسال کی جائیں۔

☆ حواشی اور حوالہ جات کے لیے اصلی مآخذ اختیار کیے جائیں اور درج ذیل تفصیل کے ساتھ مضمون کے آخر میں لگائے جائیں:

کتاب کا نام: ---------- مصنف کا نام: ---------- مطبع: ----------

سن طباعت: ---------- جلد نمبر ---------- صفحہ نمبر: ----------

☆ مجلّہ نور معرفت میں: علوم قرآن و حدیث، فقہ و اصول فقہ، کلام و فلسفہ اور اسلامی تاریخ، تقابل ادیان، تعلیم و تربیت، ادبیات، معاشیات، عمرانیات، سیاسیات، اقبالیات، ثقافت و تمدن، قانون و اصول قانون وغیرہ پر اسلامی نقطہ نظر سے مقالات شایع کئے جاتے ہیں۔

☆ مجلّہ نور معرفت میں شائع شدہ مقالات کسی اور جگہ طبع کرانے کی صورت میں مجلّہ ہذا کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

☆ علمی کتابوں پر تبصرے کے لیے مدیر مجلّہ کو کتابوں کی دو کاپیاں ارسال کی جائیں۔

فہرست

نمبر شمار	موضوع	مؤلف	صفحہ
۱	اداریہ	مدیر	۷
۲	گفتنی ہا	مدیر	۱۱
۳	ہدایت کا دائمی فیض اور واسطہ فیض	ڈاکٹر شیخ محمد حسنین	۲۳
۴	عدل الٰہی	ثاقب اکبر	۳۷
۵	مذہب اہل بیت علیہم السلام میں تکفیر کی شرعی حیثیت	سید رمیز الحسن موسوی	۵۷
۶	اطاعت امیر کا نظریہ اور حضرت امام حسینؑ کا موقف	ڈاکٹر زاہدی/ڈاکٹر زیدی	۷۴
۷	امام حسین علیہ السلام کا اخلاقی محاسن	سید حسنین عباس گردیزی	۸۹
۸	اقتصادی عدالت نہج البلاغہ کی روشنی میں	روشن علی	۱۰۶
۹	غیبت گناہ کبیرہ ہے	سید مزمل حسین نقوی	۱۳۷
۱۰	Abstract		۱۴۵

اہلِ قلم سے اپیل

سہ ماہی ''نور معرفت'' ایک علمی و تحقیقی جریدہ ہے جسے دینی مدارس اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور طلاب کے درمیان علمی و تحقیقی شوق و جستجو پیدا کرنے کی غرض سے شائع کیا جارہا ہے۔ یہ جریدہ تمام یونیورسٹیوں اور مدارس کے اساتذہ اور طلاب کا اپنا جریدہ ہے۔ لہٰذا اس جریدہ کو بہتر سے بہتر بنانے میں آپ کا علمی تعاون اور قیمتی آراء مددگار ثابت ہوں گی۔

آپ سے گزارش ہے کہ اپنی تحقیقات اور نگارشات اس جریدہ کیلئے ارسال کریں۔ آپ کی تحقیقی اور علمی تحریروں کا استقبال کیا جائے گا۔ تمام تحریریں، فرقہ وارانہ مواد سے پاک اور علمی حوالوں سے مزین ہونی چاہییں۔

مدیر

سہ ماہی مجلّہ ''نورِ معرفت''

”نمت“ ایک نظر میں

”نمت“ (نور الہدیٰ مرکز تحقیقات) نور الہدیٰ ٹرسٹ کا ایک ذیلی ادارہ ہے جو علماء اور دانشوروں کی ایک پانچ رکنی علمی کمیٹی کی نگرانی میں فعالیت کر رہا ہے۔ اس ادارے کا نصب العین اسلام کی حقیقی تعلیمات کی ترویج کے ذریعے پاکستانی قوم اور بالخصوص ملت تشیع کو فکری پسماندگی سے نجات دلا کر اسلامی تہذیب کی تشکیل کی ٹھوس فکری بنیادیں فراہم کرنا ہے۔

پاکستان کی ملت مسلمہ کی بنیادی مشکل دینی آگہی اور اجتماعی شعور کی کمی ہے۔ لہٰذا دینی بصیرت و آگہی کو فروغ دینے اور اجتماعی شعور بیدار کرنے والی کتب کی تألیف، ترجمہ اور اشاعت اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے اسلامی تعلیمات کی ترویج، نیز انہی اہداف کے حصول کیلئے ایک علمی و تحقیقی سہ ماہی مجلّہ ” نور معرفت“ کی اشاعت، ”نمت“ کے عمدہ اہداف شمار ہوتے ہیں۔

”نمت“ اپنی فعالیت کے تقریباً پانچ سالوں میں قابل ذکر مطبوعات علمی حلقوں کی خدمت میں پیش کر چکا ہے۔ حیات فاطمہ، تعلیم الاحکام، امام خمینی کی ایک مغربی دانشور سے ملاقات، حضرت زینب، تاریخ کا ایک ناگزیر کردار، اسلامی پردہ، سول سوسائٹی، امام خمینی کا سیاسی نظریہ، قرآن اور نفسیاتی دباؤ، معجزہ کیا ہے اور پیام قرآن کی آخری تین جلدوں کا ترجمہ اس ادارے کی اب تک کی عمدہ مطبوعات ہیں۔

اس کے علاوہ سہ ماہی ”نور معرفت“ کی چار سال سے مسلسل اشاعت بھی ”نمت“ کا ایک عمدہ کارنامہ ہے۔ ”نمت“ قرآن و حدیث، فلسفہ و کلام، اخلاق و عرفان اور دیگر متنوع موضوعات پر مکتب اہل بیت اطہار علیہم السلام کی تعلیمات کی روشنی میں اردو زبان میں بہتر سے بہتر لٹریچر پیش کرنے کیلئے کوشاں ہے اور اسے اس نیک کام میں ملت مسلمہ کے عوام و خواص کے تعاون کی ضرورت ہے۔

اداریہ

نورِ معرفت کا یہ شمارہ اس وقت قارئین کے ہاتھوں میں پہنچے گا جب ۲۰۱۲ء کا سورج غروب اور ۲۰۱۳ء کا سورج طلوع ہو چکا ہو گا۔ زندگی ایام کی حرکت کا نام ہے اور انسانی زندگی، انفرادی ہو یا اجتماعی، اسی وقت ترقی کی منازل طے کر سکتی ہے جب انسان ایام کی اِس حرکت پر نظر رکھے اور یہ محاسبہ کر رہا ہو کہ اُس نے یہ ایام کس طرح گذارے ہیں، اِن میں کیا کھویا اور کیا پایا ہے؟

کسی بھی قوم وملت کا ادب اور اس ادب کی عکاسی کرنے والی مطبوعات کی سب سے بڑی ذمہ داری یہی ہے کہ وہ گذرے ہوئے ایام کا محاسبہ کر کے مستقبل کے اُفق روشن کرے۔ گزشتہ سال ''نورِ معرفت'' اپنی یہ ذمہ داری پوری کرنے میں کس قدر کامیاب ہوا، اس کا فیصلہ ہم اپنے قارئین پر چھوڑتے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ آپ ایک خط، ای میل یا الیکٹرانک پیغام کے ذریعے اپنی قیمتی آراء سے ہمیں آگاہ کریں گے تاکہ ہم اپنی یہ ذمہ داری احسن طریقے سے ادا کر سکیں۔

حسب معمول نورِ معرفت کے اس شمارے میں بھی بعض علمی و تحقیقی جواہر پارے قارئین کے ذوق مطالعہ کی نذر کئے جارہے ہیں۔ سب سے پہلے ''گفتنی ہا'' کے عنوان سے '' کربلا کے مقاصد کی پاسداری'' اور ''دہشت گردی '' جیسے اُن مسائل کے ناگفتہ پہلوئوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جن میں ہم مبتلا ہیں۔ نیز اس شمارے کے علمی مقالات کے عناوین بھی بہت اہم ہیں جن میں ایک علم کلام کا اہم موضوع '' ہدایت کا دائمی فیض اور واسطۂ فیض'' ہے۔ اس مقالہ میں انسان اور پوری کائنات کی ہدایت کے عنوان پر قرآنی دلائل کی روشنی میں انتہائی عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ ایک اور فقہی اور کلامی موضوع، '' مذہب اہل بیت علیہ السلام میں تکفیر کی شرعی حیثیت'' ہے جو مسلمانوں کے مختلف مذاہب کے درمیان ہم بستگی اور رواداری کی راہیں کھولنے کی نیت سے قلمبند کیا گیا ہے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کی سیرت وروش کے مطالعے کے لئے ایک مقالہ ''امام حسین علیہ السلام کے اخلاقی محاسن'' کے عنوان سے پیش کیا جارہا ہے جو یقینا حسین علیہ السلام شناسی کے باب میں ہمارے قارئین کے ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرے گا۔ اسی طرح مسلمان فِرَق ومذاہب میں ایک معرکۃ الآراء بحث (اطاعتِ امیر) کے حوالے سے ''اطاعت امیر کا نظریہ اور حضرت امام حسین علیہ السلام کا

مؤقف" کے عنوان سے ایک جاندار تحریر بھی موجودہ شمارے میں شامل کی گئی ہے۔ یہ تحریر اس حوالے سے عام اسلامی مذاہب کے برعکس، مذہب اہل بیت اطہار علیہم السلام کی خاص رائے کی ترجمانی کرتی ہے۔

نیز علمِ کلام ہی کا ایک اور جاندار موضوع، "عدلِ الٰہی" کے عنوان پر بھی ایک تحقیقی کاوش شامل ہے جو بارگاہِ عدلِ الٰہی میں عملی آمادگی کے ساتھ حاضر ہونے میں ہماری مدد کرے گی۔ اس شمارے میں ایک اور مقالہ، علم الحدیث سے مربوط ہے جس میں اسلامی معارف کے ایک بہت بڑے ذخیرے یعنی نہج البلاغہ سے گوہر پارے جمع کرتے ہوئے مؤلف نے "نہج البلاغہ میں اقتصادی عدالت" کے عنوان سے ایک مقالہ پیش کیا ہے۔ انسان کردار کی زینت، یعنی اخلاقیات کے ایک بنیادی موضوع "غیبت" پر بھی اس شمارے میں ایک مختصر، لیکن جامع تحریر قارئین کی نذر کی جارہی ہے۔

"نور معرفت" کی ٹیم اپنی تمام تر علمی بے بضاعتی اور علمی مقالات لکھنے والوں کے فقدان کے باوجود ہر شمارے میں قوم وملت کے پڑھے لکھے طبقے کی علمی تشنگی کو بجھانے کی بھرپور سعی کررہی ہے۔ قرآن واہل بیت اطہار علیہم السلام کے معارف کو تشنگان معارف تک پہنچانا ہمارا سب سے بڑا فریضہ ہے۔ لیکن اس فریضہ کی انجام دہی میں جو فرض قارئین کا ہے، ہمیں توقع ہے کہ آپ بھی وہ فریضہ ادا کریں گے۔

☆☆☆☆☆

کربلا کے مقاصد کی پاسداری اور ہماری ذمہ داریاں

سید رمیز الحسن موسوی*
Srhm2000@yahoo.com

اسلامی تہذیب وثقافت میں علمائے دین کو انبیائے کرام علیہم السلام کے جانشین اور دین کے محافظین کے عنوان سے پہنچانا جاتا ہے۔ شاید رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ مشہور حدیث اسی مطلب پر ناظر ہے، جس میں آپؐ فرماتے ہیں:

"اِذا ظَهَرَتِ البِدَعُ فِی اُمَّتِی فَلْیُظْهِرِ العالِمُ عِلْمَهُ وَالاَّ فَعَلَیْهِ لَعْنَةُ اللهِ"۔

یعنی: "جب میری اُمت میں بدعتیں ظاہر ہونے لگیں تو عالم کے اوپر اپنا علم ظاہر کرنا فرض ہے اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس پر اللہ کی لعنت ہے۔"

(سفینۃ البحار، ج ا، ص ۶۳؛ اصول کافی، ج ا، ص ۵۴)

یہ حدیث بہت واضح الفاظ میں علمائے دین کو انبیائے کرام علیہم السلام کا جانشین اور دین کا محافظ قرار دے رہی ہے، چونکہ انبیائے کرام علیہم السلام کی منجملہ ذمہ داریوں میں سے ایک دین کی حفاظت اور اس کی توضیح و تشریح ہے اور اسے جنی وانسی شیاطین کی تحریفات اور تبدیلیوں کے خطرے سے محفوظ رکھنا ہے۔ البتہ انبیائے کرامؑ معصوم ہوتے ہیں جبکہ علمائے دین معصوم نہیں ہوتے۔ انبیاء کا معصوم ہونا عقلی و شرعی نص سے ثابت ہے، چونکہ انبیاء اگر معصوم نہ ہوں تو ان کے لائے ہوئے پیغام پر اعتماد نہیں کیا جائے گا۔

دوسرا یہ کہ انبیائے کرامؑ، اللہ تعالیٰ کی طرف سے دین دریافت کرنے کے بعد اسے لوگوں تک ابلاغ کرتے ہیں اور پھر اس کو نافذ کرنے کے علاوہ اس کی حفاظت کے بھی ذمہ دار ہیں۔ لیکن علماء فقط دین کی تبلیغ اور نفاذ

*۔ محقق، مدیر سہ ماہی مجلّہ نور معرفت، اسلام آباد۔

کے علاوہ اس کی حفاظت پر مأمور ہیں۔ مذکورہ حدیث میں علماء کے انہی دو فرائض کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جب بھی دین کو بدعتوں کا سامنا ہو تو علمائے دین کو اپنا علم ظاہر کرکے ان بدعتوں سے دین کو بچانا چاہیے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو اللہ کی لعنت کے مستحق ہیں اور جو اللہ کی لعنت کا مستحق ہو وہ حقیقی عالم دین نہیں ہو سکتا۔ احادیث میں علماء کی اس ذمہ داری کو مختلف عناوین سے ذکر کیا گیا ہے۔ کبھی ذمہ داریاں نبھانے پر تحسین کے انداز میں تو کبھی ذمہ داریاں نہ نبھانے پر مذمت کے انداز میں۔ چنانچہ ایک حدیث میں اپنی اس ذمہ داری کو انجام نہ دینے والے علماء کے بارے میں پیغمبر اسلام ﷺ فرماتے ہیں:

"آفَةُ الدِّيْنِ ثَلَاثَةٌ: فَقِيهٌ فَاجِرٌ، اِمَامٌ جَائِرٌ، مُجْتَهِدٌ جَاهِلٌ۔"

یعنی: "تین چیزیں دین کے لئے آفت ہیں: فاجر (بدکار) عالم دین، ظالم وجائر رہبر و پیشوا اور جاہل و نادان عبادت گذار۔"

(جامع الصغیر، ج۱، ص ۴)

یہ حدیث بدکار و فاجر عالم کو دین کے لئے مصیبت وآفت قرار دے رہی ہے؛ چونکہ بدکار و بے تقویٰ عالم، دین کی حفاظت کے بجائے اس کی تباہی کا باعث بنتا ہے۔ دین کی سب سے بڑی آفت اور مصیبت اس میں نئی نئی بدعتیں پیدا کرنا ہے اور ان آفات کے ذریعے دین کے چہرے کو بگاڑنا ہے۔ ان آفات کا مقابلہ وہی عالم کر سکتا ہے جو خود دین پر عمل پیرا ہو اور دین کی حفاظت وہی عالم کر سکتا ہے جو اپنے علم کے ذریعے بدعتوں کا پول کھول کر لوگوں کو ان پر عمل کرنے سے منع کرے۔

دین اسلام اور قرآن مجید کے احکام کی حفاظت اور ان کے نفاذ کا سب سے بڑا مظہر و مصداق واقعہ کربلا اور امام حسین علیہ السلام کا قیام ہے۔ اگر تاریخ اسلام میں یہ عظیم واقعہ رونما نہ ہوتا اور امام عالی مقام کا یہ قیام وجہاد انجام نہ پاتا تو دین مبین، بنی اُمیہ جیسے بدکاروں اور فاجروں کی بدعتوں کی وجہ سے نابود ہو جاتا ہے۔ یہ ایسی حقیقت ہے کہ جس کا اعتراف تمام علمائے اسلام کرتے ہیں۔ واقعہ کربلا اور شہادت امام حسین علیہ السلام کی یہی وہ بڑی خصوصیت ہے کہ جس کی وجہ سے تمام ائمہ معصومین علیہم السلام نے اس قیام اور واقعہ عظمیٰ کی یاد تازہ رکھنے کی تاکید فرمائی ہے۔

اس سلسلے میں بہت زیادہ روایات نقل ہوئی ہیں جن میں واقعہ کربلا کی یاد منانے اور عزاداری امام حسین علیہ السلام برپا کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور اس پر بہت زیادہ اجر وثواب ذکر کیا گیا ہے۔ عزائے

حسینی کے بارے میں اس قدر تاکید کی سب سے بڑی وجہ اس قیام وجہاد کا مقصد وفلسفہ ہے جو یزیدیوں کے اعمال کی قباحت اور اہل عاشورا کے قیام کی تحسین وتکریم ہے تاکہ یزیدی اعمال سے بچا جائے اور حسینی کردار کو اپنایا جائے۔

اگر قیام عاشورا کی یاد منانے سے یہ مقصد پورا ہوتا ہے تو یقینا یہ یاد منانا اور عزائے حسینی برپا کرنا عظیم اجر وثواب رکھتا ہے اور احیائے دین کا سب سے بڑا مصداق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے دین نے عزاداری امام حسین (ع) کو "شعائرِ دین" میں سے قرار دیا ہے اور اس کی حفاظت و تبلیغ کو دین کی حفاظت و تبلیغ کہا ہے۔

پس عزاداری، اسلام کو زندہ رکھنے اور کفر وشرک کو نابود کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ جب اس میں قیام امام حسین علیہ السلام کے مقاصد کو مد نظر رکھا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے اس عظیم واقعہ کو من وعن زندہ رکھنا، اس کے مقاصد کہ جو درحقیقت مقاصدِ اسلام ہیں، کی حفاظت کرنا اور اس کو بدعتوں سے بچانا، علمائے دین کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔

جس قوم وملت نے بھی کربلا کے مظلوموں کے مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے عزاداری منعقد کی ہے اور اسے تحریفات وخرافات سے آلودہ نہیں ہونے دیا، یقیناً اُس نے ظلم وستم اور اغیار وسامراج کی غلامی سے نجات حاصل کی ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال ایران کا اسلامی انقلاب ہے کہ جس کو اسی عزائے حسینی سے عروج ملا ہے اور اسی گریہ وماتم کی مجالس سے دوام حاصل ہوا ہے۔ انقلاب اسلامی کے بعد آج تک یہی امام حسینؑ کی عزاداری ہے کہ جس نے دنیا بھر کے مظلوموں اور محروموں کو ظلم وستم اور استبداد وآمریت کے خلاف قیام کرنے کی جرائت دی ہے۔

آج بحرین ہو یا سعودی عرب، فلسطین ہو یا لبنان وشام ہو یا عراق سبھی مسلمان ممالک میں اسی قیام حسینی کی پیروی میں لوگ ظلم وستم کے خلاف قیام کر رہے ہیں، چونکہ وہاں کے علماء نے عزاداری امام حسینؑ کی حفاظت کی ہے اور اسے اپنے راستے سے گمراہ ہونے سے بچایا ہے۔ لیکن جہاں علمائے دین نے عزاداری امام حسینؑ کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کیں اور اسے عوامی احساسات وجذبات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا ہے تو وہاں عزاداری کے نام پر نئی نئی بدعتیں پیدا ہوتی رہی ہیں، جنہوں نے اسے اپنے مقاصد سے کوسوں دور کر دیا ہے۔

آج عزاداری کو مختلف بہانوں سے دین کے مقابلے میں لایا جارہا ہے: کہیں نماز کہ جو قیام امام حسینؑ کی روح ہے، کا موازنہ عزاداری امام حسینؑ سے کیا جارہا ہے اور کہیں عشق امام حسینؑ کے نام پر ضروریات دین کی توہین کی جارہی ہے اور کہیں عقلانیت کو بالائے طاق رکھ کر خلاف عقل حرکات کو عزاداری امام کے عنوان سے انجام دیا جارہا ہے۔ اور یہ سب کچھ بعض علماء و خطباء اور ذاکرین کی اپنے فرائض انجام نہ دینے کی وجہ سے ہو رہا ہے۔

آج ہماری عزاداری اس قدر جمود اور بے شعوری کی کا شکار ہو چکی ہے کہ اس سال محرم الحرام میں جہاں دہشت گردی کے بیسیوں واقعات میں عزادارانِ امام حسینؑ کے لاشے گرے وہاں روایتی عزاداری کے بانیوں نے اعلان کیا کہ: ہم نے آٹھ ربیع الاول تک امام حسینؑ کی عزاداری کرنی ہے اور اس ظلم و ستم اور قتل و غارت پر کسی قسم کا احتجاج نہیں کرنا!! یعنی چودہ سو سال پہلے کے یزید کے ظلم و ستم پر ماتم و گریہ کرنا ہے، لیکن عصر حاضر کی یزیدیت کے ظلم و ستم پر احتجاج نہیں کرنا! یہی منطق، روح عزاداری کے خلاف ہے اور شہدائے کربلا بالخصوص امام حسین علیہ السلام کے اُسوہ اور نمونہ عمل ہونے کی نفی کرتی ہے۔

یہ وہ عزاداری ہے جسے طاغوت پسند کرتا ہے اور ایسی عزاداری کے فروغ کے لئے ہر ظالم و جابر حکمران ہر قسم کی مراعات دینے کو تیار ہے اور ہر شہید و زخمی ہونے والے عزادار کے عوض اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیتا ہے، لیکن جہاں یہ عزاداری طاغوت شکن ہے اور "کل یوم عاشورا و کل ارض کربلا" کا منظر پیش کرتی ہے، وہاں طاغوتی طاقتیں اس کے راستے میں بڑی سے بڑی رکاوٹ کھڑی کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتیں۔

ظلم ستیز اور طاغوت شکن عزاداری اُسی وقت برپا ہو سکتی ہے جب وہ عقلانیت اور شعور کے ہمراہ ہو اور ان دونوں چیزیں کے لئے جہاں عوامی جذبات و احساسات کی ضرورت ہے وہاں علم و معرفت اور چشم بصیرت کی بھی ضرورت ہے۔ لہٰذا کربلا کے پیغام کی حفاظت کے لئے ضروری ہے کہ اس واقعے کو ہر قسم کی تحریف سے محفوظ رکھا جائے۔ نیز عزاداری کا دین کے احکام اور بالخصوص نماز جیسے اہم حکم الٰہی کے ساتھ موازنہ کرنے یا مصائب اہل بیت اطہار علیہم السلام کے بیان میں جدّت پیدا کرنے کے بہانے روایات عزا میں دخل و تصرف اور عزاداری کی رسومات میں ہر قسم کی بدعت ایجاد کرنے سے بچا جائے۔ یہاں علماء کا فریضہ ان امور پر توجہ دلانا اور خطبائ، ذاکرین اور عوام کا فریضہ علماء کی نصیحتوں پر عمل کرنا ہے اور تنہا اسی راستے پر چل کر ہی ہم بامقصد عزاداری قائم کر سکتے ہیں۔

دہشت گردی کی جڑیں تلاش کرنے کی ضرورت

دہشت گردی ایک ایسی مصیبت ہے جو پچھلی تین دہائیوں سے مملکت پاکستان کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہی ہے اور آئے دن دہشت گردی کے واقعات کی وجہ سے پاکستان کمزور سے کمزور ہوتا چلا جارہا ہے اور پاکستانی معاشرے کے امن و سکون کے علاوہ اس کے دیگر کئی بنیادی حقوق بھی پامال ہورہے ہیں۔ لیکن ان تیس سالوں کے دوران جتنے بھی حکمران گذرے ہیں وہ اس ناسور کو ختم کرنے کے سلسلے میں بلند و بانگ دعوے کرنے کے باوجود ناکام و نامراد نظر آئے ہیں۔

آج تک کوئی حکمران اپنے ملک کے اُن باشندوں کو امن و سکون جیسی بنیادی ضرورت فراہم نہیں کر سکا جن کے ووٹوں سے وہ منتخب ہو کر کرسی اقتدار پر قابض ہوئے ہیں۔ نہ کسی حکمران اور نہ کسی دوسرے معاشرتی مفکر و دانشور نے اپنی اس ناکامی اور بے بسی کا سبب جاننے کی کوشش کی ہے۔ جب بھی کوئی ایسا المناک واقعہ پیش آیا ہے، صاحبان اقتدار نے رٹے رٹائے بیانات اور رسمی اظہار افسوس کے سوا اور کوئی اقدام نہیں کیا اور نہ کوئی ٹھوس لائحہ عمل پیش کیا ہے۔

اب تک دہشت گردی کے جتنے بھی واقعات ہوئے ہیں، خواہ اس میں مسلمانوں کی عبادت گاہوں کو نشانہ بنایا گیا ہو یا غیر مسلموں کی جانیں ضائع ہوئی ہوں، سب میں ایک قدر مشترک نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ ان سب ظالمانہ واقعات میں انتہائی وحشیانہ طریقوں سے انسانی جانیں لی گئی ہیں، ایسے وحشیانہ طریقے کہ جو کوئی کلمہ گو مسلمان خواہ اُس کا کسی بھی مذہبی فرقے سے تعلق ہو، اختیار نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ حال ہی میں مستونگ میں ایران کے مقدس مقامات کی طرف جانے والے زائرین کی بسوں پر حملوں میں کیا گیا ہے۔ اس واقعے میں شہید ہونے والے زائرین کی لاشوں کو راولپنڈی کی ایک ہسپتال میں لایا گیا ہے۔ عینی شاہدین کے مطابق اس واقعہ میں شہید ہونے والے زائرین کی لاشیں اس قدر جلی ہوئی تھیں کہ کسی جنازے کی شناخت نہیں ہو سکی۔ یعنی؛ ان حملوں میں ایسا مواد استعمال کیا جاتا ہے جس سے انسانی جسم کی ہیت ہی بدل جاتی ہے۔ یہ اگر کسی سیاسی یا متعصب فرقہ پرست مسلمان کا کام ہوتا تو شاید اس قدر ظالمانہ اور وحشیانہ نہ ہوتا۔ ان واقعات کی نوعیت سے پتا چلتا ہے کہ یہ کسی شیطانی اور انسانیت دشمن گروہ

کی کاروائی ہے۔ لیکن جب بھی ایسے المناک واقعات ہوتے ہیں، ان کی ذمہ داری یا تو کسی فرقہ پرست و متعصب گروہ پر ڈال دی جاتی ہے یا اسے ہمسایہ ممالک کی سیاسی رقابت کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے اور اصل چہروں کو بے نقاب نہیں کیا جاتا۔

اگر عالمی حالات کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہو جائے گا یہ وہی طریقے ہیں کہ جو اس وقت عالمی شیطانی طاقتیں پوری دنیا میں اپنا رہی ہیں۔ پوری دنیا میں ہونے والی ظالمانہ کاروائیوں کو دیکھا جائے تو اس قسم کے تمام واقعات کی بازگشت امریکہ اور اس کے ناجائز فرزند، صیہونی اسرائیل کی طرف ہوتی ہے۔ جن کی انسانیت دشمنی اور وحشیانہ کاروائیوں کی پوری دنیا شاہد ہے اور آج ان کے اپنے ممالک کے اعتدال پسند عوام بھی ان کی انسان سوز حرکات پر سراپائے احتجاج بنے ہوئے ہیں۔

پاکستان میں بھی اب تک جتنی بھی دہشت گردی ہوئی ہے، خواہ وہ نام نہاد مسلمان گروہ طالبان کے ذریعے ہوئی ہو یا پاکستان کے کسی فرقہ پرست گروہ کی جانب سے، ہر ایک میں یہی انداز اپنایا گیا ہے جو فقط عالمی صیہونیت کا خاصہ ہے۔ لیکن نامعلوم وجوہات کی بنا پر ان واقعات کے اصل اسباب کی طرف نہ تو حکمرانوں کی توجہ جاتی ہے اور نہ کسی تجزیہ نگار کی۔ اگر پاکستان میں دہشت گردی کی اصل جڑیں تلاش کی جائیں تو یقینا ان تمام ظالمانہ واقعات کی جڑیں اسرائیل میں ملیں گی اور ان کے پیچھے مختلف عناوین سے عالمی شیطانی گروہ صیہونیت کا ہاتھ ہوگا۔ چونکہ انسانیت کو ختم کرنے کے یہ ظالمانہ طریقے اسی گروہ کی ایجاد ہیں کہ جو انسانیت کو سسک سسک کر مرتا دیکھ کر تسکین حاصل کرتا ہے۔

لہٰذا ہمارا ایمان ہے کہ اس میں کسی مسلمان گروہ یا فرقے کا ہاتھ نہیں ہو سکتا۔ اس کی جڑوں تک پہنچنے کے لئے خدا پر ایمان کے علاوہ ایک خاص چشم بصیرت کی ضرورت ہے۔ ایسی چشم بصیرت جو مسلمانوں اور دین اسلام کو بدنام کرنے والے اُن تمام صیہونی گروہوں کے چہروں کو بے نقاب کر دے جو مختلف فرقہ وارانہ ناموں سے پاکستان میں کام کر رہے ہیں۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ جب ہمارے حکمران دہشت گردی کی اصل جڑوں تک پہنچنے کی کوشش کریں تو اس وقت اُنہیں معلوم ہو جائے گا کہ آج سے تیس سال پہلے ایک درویش صفت مسلمان رہنما خمینی بت شکن کا یہ قول کتنا سچا ہے کہ " ہماری تمام مشکلات و مصائب کا سبب امریکہ اور اسرائیل ہیں۔"

آہ ! سید حسین عارف نقوی

مجلّہ نور معرفت کا یہ شمارہ آخری مراحل سے گذر رہا تھا کہ مشہور کتاب شناس اور تذکرہ نویس سید حسین عارف نقوی کے اس جہان فانی سے عالم بقاء کی جانب کوچ کر جانے کی المناک خبر ملی۔ مرحوم ایک عرصے تک "نور معرفت" کی مجلس مشاورت کے رکن رہے اور کتاب شناسی کے عنوان سے اُن کے مقالات اس جریدے کی زینت بنتے رہے۔ اُنہیں اپنے فن میں خاصی مہارت حاصل تھی، جس کی وجہ سے اُنہوں نے مختلف عناوین پر سینکڑوں کتب کا تعارف کرایا۔ مختلف جرائد واخبارات میں اُن کی فہرستیں اور علمی شخصیات کے تذکرے شائع ہوتے رہے ہیں جن میں "تذکرہ علمائے امامیہ پاکستان" اور "برصغیر کے امامیہ مصنّفین کی مطبوعہ تصانیف اور تراجم" قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں کتابیں دو دو جلدوں میں چھپ چکی ہیں۔ تذکرہ علمائے امامیہ پاکستان کی دوسری جلد شمالی علاقہ جات سے متعلق ہے۔ اس کے علاوہ مرحوم کے قلم سے امامیہ کے خلاف لکھی جانے والی کتب و مطبوعات کی ایک فہرست بھی چھپ چکی ہے۔

سید حسین عارف نقوی مرحوم کا تعلق بنیادی طور پر تعلیم کے شعبے سے تھا، لیکن کتاب شناسی اور تذکرہ نویسی اُن کا علمی مشغلہ تھا جس کی خاطر اُنہوں نے بہت سے ممالک کے سفر کئے اور خود پاکستان کے چپے چپے کو دیکھا۔ وہ اس کام کو مشنری جذبے سے انجام دیتے تھے اور ہر جدید کتاب کی زیارت اور ہر علمی شخصیت سے خواہ وہ عام طالب علم ہی کیوں نہ ہو، ملنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ بستر علالت پر بھی اُن کا ہم و غم کتاب اور علمی مجلات ہی تھے۔ اُن کی وفات سے یقینا علمی حلقوں میں ایک عرصے تک خلاء محسوس ہوگا۔

بارگاہ الٰہی میں مرحوم کی مغفرت اور اُن کے پسماندگان اور دوستوں کے لئے صبر جمیل کی دعا ہے۔ نور الہدیٰ مرکز تحقیقات، اسلام آباد اور مجلّہ نور معرفت کی پوری ٹیم کی جانب سے اُن کے اہل خانہ اور دوستوں کی خدمت میں تعزیت و تسلیت پیش کی جاتی ہے۔

شریک غم

مدیر نور معرفت، اسلام آباد

انبیاء کی معنوی تربیت کا عوام پر اثر

امام خمینیؒ نے فرمایا:

اگر انسانوں سے انبیاء کو استثناء کریں اور بالفرض شروع ہی سے انبیاء نہ ہوتے اور انسان خود ہی اپنے حال پر آگے بڑھتا، اگر ایسا ہوتا تو انسان ہلاکت اور تباہی پر پہنچ جاتا اور انسانوں میں کوئی خوشگوار ماحول قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ آج آپ دیکھتے ہیں انسانوں کی ایک بڑی تعداد اچھی ہے اور وہ عوام الناس ہیں تو یہ ان انبیاء کی معنوی تربیت ہی کا نتیجہ ہے۔ انبیائے خدا علیہم السلام کی معنوی تربیتیں باوجودیکہ سب نے ان تعلیمات کو مانا نہیں اس کے باوجود دنیا میں ان تعلیمات کا نور پھیلا ہوا ہے کہ عام لوگ، عام مستضعف لوگ سارے اچھے ہیں ان میں برائی کم ہی پائی جاتی ہے۔

(امام خمینیؒ، اقتباس از صحیفہ امام، ج ۱۶، ص ۵۰۰)

*****

ہدایت دائمی فیض اور واسطہ فیض

ڈاکٹر شیخ محمد حسنین*
Sheikh.hasnain26060@gmail.com

خداوند تعالی اس کائنات کا خالق بھی ہے الٰہی اور ہادی بھی۔ ہدایتِ الٰہی کا فیض دائمی ہے اور کائنات کی ہر چیز ہر آن یہ فیض پا رہی ہے۔ کائنات میں فیضِ ہدایت کے دوام پر ایک دلیل خداوند تعالی کی "قیومیّت" ہے۔ در حقیقت، کائنات کی ہر چیز کا ذاتی فقر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے میں ہر آن خدا کی ہدایت کی محتاج ہو۔ خدا کے فیض ہدایت کے دوام کی دوسری دلیل، طلب ہدایت کا دوام ہے۔ بنی نوع انسان کو قرآن کریم میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ دائمی طور پر بارگاہ الٰہی سے فیضِ ہدایت پانے کی دعا کرے اور یہ امر از خود اس بات کی دلیل ہے کہ ہدایت کا فیض دائمی ہے۔ نیز اگر قرآن کریم کی صورت میں ہدایت الٰہی کا فیض ہمیشہ کیلئے جاری ہے تو یہ دعوی ثابت شدہ ہے کہ ہدایتِ الٰہی کا فیض دائمی ہے۔

لیکن یہاں سوال یہ ہے کہ آیا خداوند تعالی کی یہ دائمی ہدایت، بغیر کسی واسطۂ فیض کے جاری ہے؟ اس سوال کے جواب میں کئی موَقف اپنائے جا سکتے ہیں۔ یہاں واسطۂ فیض کی ضرورت کا سرے سے انکار بھی کیا جا سکتا ہے اور اس واسطہ کو ایک دو واسطوں میں محدود و منحصر بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہاں حقیقت یہ ہے کہ جہاں ہدایتِ الٰہی کا فیض دائمی ہے، وہاں اِس فیض کے بنی نوع بشر تک پہنچنے کیلئے واسطۂ فیض کا دوام بھی شرط ہے۔ اور اگر ایسا ہے تو یہ واسطہ کیا ہے؟ یا کون ہیں؟

یہاں قرآن کریم کی بیسیوں آیات کی روشنی میں واسطۂ فیض کی تشخیص کا جو معیار ہمارے پاس ہے وہ یہ کہ فیضِ ہدایت کے اس واسطہ کو لازمی طور پر: (۱) خدا کا انتخاب شدہ ہونا چاہیے؛ کیونکہ قرآن کریم کی کئی آیات کی روشنی میں خداوند تعالی نے بنی نوع انسان کی ہدایت کیلئے جس شخص یا شئے کو بھی واسطہ قرار دیا ہے اُس کا انتخاب خود فرمایا ہے۔ فیضِ ہدایت کے واسطہ کو ہر قسم کی خطا و لغزش اور سہو و نسیان سے "معصوم" ہونا چاہیے۔ اس دعوی کی عمدہ دلیل بھی یہ ہے کہ قرآن کریم کی کئی آیات کی روشنی میں خداوند تعالی نے ہدایتِ بشر کیلئے جس واسطہ کا بھی انتخاب فرمایا ہے، وہ ہدایتِ الٰہی کے فیض کو بنی نوع بشر تک پہنچانے کے عمل میں ہر قسم کی تحریف، خطا و لغزش اور عصیان و نسیان سے پاک ہے۔ لہٰذا عصرِ حاضر کے انسان کیلئے ہدایت الٰہی کا ایک ایسا واسطہ جو خدا کی بارگاہ کا "منتخب" بھی ہو اور "معصوم" بھی فقط اہل تشیع کے نظریۂ "امامت" میں تجسم پاتا ہے۔

*۔ ڈائریکٹر نمت نور الہدیٰ ٹرسٹ، بھارہ کہو، اسلام آباد

مقدمہ

سہ ماہی ''نور معرفت'' کی جلد ۳، شمارہ ۱ (جنوری تا مارچ ۲۰۱۲ء) میں ''نبوت، ختم نبوت اور دین کی تکمیل'' کے عنوان سے راقم الحروف کا ایک مقالہ چھپ چکا ہے۔ اس مقالے کا ایک ذیلی عنوان ''ہدایت'' تھا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ خداوند تعالیٰ، نہ تنہا عالم ہستی کا خالق، بلکہ اس کا ''ہادی'' بھی ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی ارشادِ ربانی ہے:

'' قَالَ رَبُّنَا الَّذِی أَعْطیٰ کُلَّ شَیْئٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدٰی'' (1)

یعنی: ''موسیٰ نے کہا: ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر شئے کو اُس کی خلقت بخشی، پھر ہدایت دی''۔

اس حوالے سے ایک اور مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبانی ارشاد باری تعالی ہے:

'' الَّذِی خَلَقَنِی فَهُوَیَهْدِینِ'' (2)

یعنی: '' (عالمین کا پروردگار) وہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا؛ پھر وہی مجھے ہدایت دیتا ہے۔''

ایک اور مقام پر خداوند تعالی نے اپنی مخلوق کی ہدایت کو اپنا فریضہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتا ہے:

''اِنّ عَلَیْنَا لَلْهُدٰی'' (3)

یعنی: ''یقینا راستہ دکھانا ہماری ذمہ داری ہے۔''

نیز خداوند تعالی کی یہ ہدایت اتنی عام ہے کہ ہر ذی شعور اور غیر ذی شعور چیز کو حاصل ہے:

'' الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی وَ الَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی'' (4)

یعنی: '' جس نے خلق کیا اور توازن پیدا کیا؛ اور جس نے تقدیر بنائی، پھر ہدایت بخشی۔''

چنانچہ ''تقدیر''، تخلیق سے بھی گویا آگے کا ایک مرحلہ ہے اور منصوبہ بندی کے معنوں میں اور ہر مخلوق کیلئے ایک خاص ہدف، منزل، راہ و رسم اور حدود و قیود کی ترسیم کے معنوں میں ہے۔ یعنی خداوند تعالی نے کائنات کی ہر شئے کی ایک منزل معین فرمائی ہے اور اُس کے اندر اِس منزل تک پہنچنے کی ہدایت رکھ دی ہے۔ لہٰذا انسان بھی اس کلی قانون سے خارج نہیں ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتا ہے:

''وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰها فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰیهَا'' (5)

یعنی: " اور نفس کی (قسم) اور اس کی جس نے اسے معتدل بنایا؛ پھر اسے بدکاری اور بدکاری سے بچنے کی سوجھ بوجھ عطا کی۔"

بنابرایں، اللہ تعالی نے جس چیز کو بھی خلق فرمایا ہے، اُسے ہدایت بھی عطا کی ہے۔ لیکن جیسا کہ اوپر اشارہ ہوا، یہاں یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ کسی شخص یا شئے کی ہدایت اُس وقت معنی پاتی ہے جب اس کی کوئی منزل مقصود بھی معیّن ہو۔ لہٰذا ان آیات سے جو بات بڑی واضح طور پر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ وجود پانے کے بعد کائنات کی ہر شئے کیلئے بالعموم اور انسان کیلئے بالخصوص کوئی منزل مقصود معین ہے جس تک پہنچنا ضروری ہے۔ لیکن چونکہ مخلوقات کو اپنی منزل مقصود کا شعور تنہا خداوند تعالی کی رہنمائی کی صورت میں ہی حاصل ہو سکتا ہے، لہٰذا اُن کی رہنمائی اور "ہدایت" خدا پر ہے اور خداوند تعالی جہاں عالم کائنات کی اشیاء کو خلق فرماتا ہے، وہاں انہیں منزل مقصود تک پہنچنے کی ہدایت بھی عطا فرماتا ہے۔

ہاں! اس فرق کے ساتھ کہ جنّات اور انسان کے علاوہ دیگر تمام موجودات عالم میں ہدایت کا یہ سلسلہ "تکوینی" ہے؛ یعنی "ایصال الی المطلوب" یا دوسرے الفاظ میں "منزل مقصود تک پہنچا دینے" کے معنوں میں ہے۔ مثال کے طور پر خداوند تعالی آم کی گٹھلی کا خالق بھی ہے اور اُس کا ہادی بھی؛ یعنی آم کی گٹھلی کو گٹھلی بنا کر خود اُس کے حال پر چھوڑ نہیں دیتا کہ اب خود سفر طے کرتی آم کا درخت بنے، بلکہ اپنی قدرت کاملہ کے طفیل ہر آن اُسے آم کا درخت بننے کی جانب لے جاتا ہے؛ یہاں تک کہ یہ گٹھلی آم کا قدآور درخت بن جاتی ہے۔ ہدایت کے اس سلسلہ کو "ہدایت تکوینی" یا "ایصال الی المطلوب" یعنی "انگلی پکڑ کر منزل مقصود تک پہنچا دینا" کہا جاتا ہے۔

جہاں تک جنّات اور انسانوں کا تعلق ہے تو اُن کے اختیاری افعال میں ہدایت کا یہ سلسلہ "تشریعی" اور "ارائۃ الطریق" یا دوسرے الفاظ میں "منزل دکھانے" کے معنوں میں ہے۔ یعنی خداوند تعالی جنّ و انس کو اُن کی اُنگلی پکڑ کر منزل مقصود تک نہیں لے جاتا، بلکہ انہیں ارادہ و اختیار اور عقل و شعور کی قدرت عطا کرنے کے بعد فقط رہنمائی فرماتا ہے کہ تمہاری منزل مقصود کیا ہے اور تمہیں اس منزل تک کیسے پہنچنا ہے۔ درحقیقت، انسان کا دیگر مخلوقات پر امتیاز اسی میں ہے کہ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے انسانیت کی منزل مقصود تک خدا کی عطا کردہ طاقت و استعداد کے سہارے خود پہنچ سکتا ہے۔

بہر صورت، عالم کائنات کی ہر چیز، ہر آن ہدایت کا فیض پا رہی ہے اور اسی ہدایت الٰہی کے طفیل یہ نظام ہستی چل رہا ہے۔ پانی اگر ہے اور سیراب کر رہا ہے، خاک اگر ہے اور اُگا رہی ہے، گٹھلی اگر ہے اور درخت بن رہی ہے، درخت اگر ہے اور پھل دے رہا ہے، سورج اگر ہے اور گردش کر رہا ہے، افلاک اگر ہیں اور اپنے اپنے مدار میں گھوم رہے ہیں، انسان اگر ہے اور فعالیت کر رہا ہے۔۔۔ تو یہ سب کچھ ہر آن، ہدایت الٰہی کے دائمی فیض کے طفیل ہو رہا ہے۔

پس ہدایت کا یہ فیض دائمی ہے اور یہی اس مقالے کا مدعی ہے؛ نیز ہمارا مدعی یہ بھی ہے کہ ہدایت کا یہ دائمی فیض ہمیشہ ایک واسطۂ فیض کے طفیل ہی جاری ہے کہ جب بھی انسان اُس واسطۂ فیض کے دروازے سے بھٹک جائے، فیضِ ہدایت سے محروم اور گمراہ ہو جاتا ہے۔ ذیل میں ہم پہلے اِس امر پر چند دلائل پیش کریں گے کہ ہدایت بنی نوع بشر کا الٰہی فیض دائمی ہے اور اس میں کوئی تعطل اور کوئی وقفہ نہیں ہے اور اگلے مرحلہ میں یہ بات ثابت کی جائے گی کہ ہدایت کا یہ فیض، ایک مخصوص واسطۂ فیض کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔

ہدایت کے فیض کے دوام کے دلائل

1۔ خداوند تعالیٰ کی نگہبانی

فیضِ ہدایت کے دوام پر سب سے اہم دلیل، خداوند تعالیٰ کی "قَيُّوْمِيَّتْ" یا "نگہبانی" ہے۔ اسمائے حسنیٰ الٰہی میں سے ایک انتہائی اہم اسم "القیّوم" ہے۔ چنانچہ ارشاد ربّانی ہے:

"اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ" (6)

یعنی: "اللہ وہ (ذات) ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ اور سب کا نگہبان ہے۔"

عربی قواعد کے لحاظ سے "القیّوم" مبالغے کا صیغہ ہے اور یہ اِسم اُس ہستی پر بولا جاتا ہے جو نہ فقط خود قائم ہو بلکہ دوسروں کی بھی نگہبانی کرے اور انہیں سنبھالے رکھے۔ چنانچہ مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں علامہ طباطبائیؒ کا ارشاد ہے:

"و القیام هو حفظ الشیء و فعله و تدبیره و تربیته و المراقبة علیه و القدرة علیه۔۔۔"

یعنی: ''قیام، نام ہے کسی شئے اور اُس کے فعل کو سنبھالنے، اُس کی تدبیر اور تربیت کرنے اور اس کی نگہبانی اور اس پر قادر ہونے کا۔'' (7)

اس مختصر عبارت میں علامہ طباطبائیؒ یہ بتا رہے ہیں کہ نہ تنہا ہر شئے اور شخص کی حفاظت اور نگہداری خدا کا کام ہے، بلکہ ہر شئے اور شخص کی تأثیر اور فعل کی حفاظت بھی خداوند تعالی کا کام ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ خداوند تعالی مثال کے طور پر نہ تنہا پانی کو پانی باقی رکھتا ہے بلکہ اُس میں پیاس بجھانے کی تأثیر بھی ہر آن خدا کی ''نگہبانی'' کی محتاج ہے۔ اگر ایک آن کیلئے خداوند تعالی کی ''نگہبانی'' نہ ہو، پانی، پانی نہیں رہے گا، اور اگر خدا کی ''نگہبانی'' نہ ہو، پانی میں پیاس بجھانے کی تأثیر بھی نہیں رہے گی۔ اگر خداوند تعالی کی ''نگہبانی'' نہ ہو، کوئی انسان، انسان باقی نہیں رہے گا، اگر خداوند تعالی کی ''نگہبانی'' نہ ہو، کوئی انسان نہ انسانی افعال انجام دے سکے گا، نہ اس میں انسانی کمالات باقی رہیں گے۔

بنابَرایں، ''القیّوم'' کا اطلاق اُس ذات پر ہوتا ہے جو کائنات کی ہر شئے اور ہر شئے کی تأثیر اور اس کے فعل کو سنبھالے ہوئے ہے؛ ہر شئے کی تدبیر و تربیت اُس کے ذمہ اور ہر شئے کی نگہبانی اور اُس پر غلبہ و قدرت اُسے حاصل ہے اور یہ ذات فقط اور فقط اللہ تبارک و تعالی کی ذات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں ''حیات'' اور ''قیّومیّت'' کو اللہ تبارک و تعالی کی ذات میں منحصر کر دیا گیا ہے: '' هُوَالْحَیُّ الْقَیُّومُ۔''

علامہ طباطبائیؒ کے بقول خداوند تعالی کی قیّومیّت اس قدر عام اور وسیع ہے کہ: ''۔۔۔ موجودات ہستی کا نظام، خواہ خود یہ موجودات ہوں، خواہ اُن میں پائے جانے والے اثرات ہوں، سب کچھ اللہ تعالی کی قیّومیّت کے تحت چل رہا ہے؛ وہ بھی نہ تنہا عالم طبیعت کے فاقدِ شعور اسباب کی سی قیمومت؛ بلکہ ایسی زندہ قیّومیّت کہ جس کا لازمہ، علم اور قدرت ہے۔ پس اللہ تعالی کا علم سب اشیاء میں نافذ ہے، اُس پر کوئی چیز مخفی نہیں اور اللہ تعالی کی قدرت بھی سب پر غالب ہے؛ لہٰذا جب تک خدا کا اِذن اور اس کی مرضی و مشیّت نہ ہو، کائنات میں کچھ تحقق نہیں پا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ (آیۃ الکرسی کے) دو آیات بعد ارشاد فرماتا ہے: ''بے شک اللہ پر زمین و آسمان میں کوئی چیز مخفی نہیں ہے، وہ وہی ہے جو ماؤں کے رحموں میں جیسی چاہتا ہے تمہاری تصویریں بناتا ہے۔'' (8)

خداوند تعالی کی ''قیّومیّت'' پر ذیل کی آیۂ شریفہ بھی بخوبی دلالت کرتی ہے:

شَهِدَ اللهُ أَنَّهُ لاَ إِلَهَ إِلاَّ هُوَ وَالْمَلاَئِكَةُ وَأُوْلُوا الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ لاَ إِلَهَ إِلاَّ هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔ (9)

یعنی: ''اللہ نے خود گواہی دی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں اور اہل علم نے بھی یہی گواہی دی ہے؛ وہ عدل قائم کرنے والا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ بڑا غالب اور حکمت والا ہے۔''

اس آیت کی تفسیر میں علامہ طباطبائیؒ کا بیان یہ ہے کہ: ''خدا نے موجودات عالم کو ایک عادلانہ نظام کے تحت قائم رکھا ہے۔ لہٰذا وہ عالم ہستی میں جسے جو کچھ عطا کرتا ہے، عدل کی ترازو پر عطا کرتا ہے اور جس سے جو کچھ روکتا ہے تو بھی عدل کی ترازو پر روکتا ہے۔'' علامہؒ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ: ''اس بیان سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ ''القیّوم'' کا نام، خداوند تعالی کے تمام اسمائے اضافیہ (وہ اسماء جو ایسے معانی پر دلالت کرتے ہیں جو ایک لحاظ سے ذاتِ باری سے خارج ہیں؛ جیسے خالق، رازق۔۔۔) کا سرچشمہ ہے۔'' (10)

بنابرایں، قرآن کریم نے خداوند تعالی کی مقدس ذات کو ''قیّوم'' قرار دیا ہے اور ''قیّومیّت'' کے دل میں تمام اسمائے حسنیٰ الٰہی چھپے ہوئے ہیں۔ لہٰذا خداوند تعالی کا ''ہادی'' ہونا بھی اس کے قیّوم ہونے کا لازمہ ہے اور اس کی ''قیّومیّت'' کے دل میں ''ہدایت'' نہفتہ ہے؛ کیونکہ جو ''قیّوم'' ہو ضروری ہے کہ وہ ہادی بھی ہو۔

لیکن سوال یہ ہے کہ آیا خداوند تعالی کی ''نگہبانی'' کسی خاص مکان و زمان کے ساتھ محدود ہے یا وہ مقدس ذات ہر آن اور ہر لمحہ، ازل سے ابد تک ''قیّوم'' ہے؟ یقینا وہ ہر آن اور ہر لمحہ ''قیّوم'' ہے اور جب ہر لمحہ قیّوم ہے تو ماننا پڑے گا کہ اس کی ہدایت کا فیض بھی ہر آن جاری اور دائمی ہے اور ہدایت کی یہ جوئے رواں ہر آن کمالِ طہارت کے ساتھ بہہ رہی ہے اور تشنگانِ نور و معرفت کو سیراب کر رہی ہے۔ کائنات کی ہر شئے کی تخلیق اور اس کی ہدایت، خداوند تعالی کی ناقابل تغییر سنت ہے۔ خدا کی دائمی نگہبانی، ہر شئے کو ہر لمحہ فیضِ ہدایت کے ساغر پلا رہی ہے اور کاروانِ کائنات، تنہا اُس مقدس ذات کے دائمی فیضِ ہدایت کے طفیل سوئے منزل رواں دواں ہے۔ بنابرایں، انسانیت کا کارواں بھی اگر اپنی منزلِ مقصود کی طرف گامزن ہے تو اُس کی دائمی ہدایت کے سہارے گامزن ہے۔

2۔ طلب ہدایت کا دوام

ہدایتِ الٰہی کے فیض کے دوام پر دوسری بڑی دلیل، طلبِ ہدایت کا دوام ہے۔ قرآن کریم کی آیات کی روشنی میں جہاں خداوند تعالی "قیّوم" ہے اور اس کی "نگہبانی" کی کوکھ میں "ہدایت" کا دائمی فیض نہفتہ ہے، وہاں تمام مخلوقات، بشمول انسان، سب کی ذات میں ہدایت کی طلب کا دائمی تقاضا پوشیدہ ہے۔ ایک طرف مسلسل فیاضی اور عطا و بخشش ہے، جبکہ دوسری طرف مسلسل گدائی، فقر اور اخذ و قبول ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتا ہے:

"یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰهِ وَ اللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ۔ (11)

یعنی: " اے لوگو! تم بس اللہ کی بارگاہ میں فقیر ہی ہو اور اللہ ہی بے نیاز اور لائق ستائش ہے۔"

چنانچہ جس طرح اس کائنات کی ہر شئے اپنے وجود اور اپنے فعل اور تأثیر میں ہر آن فیضِ الٰہی کی محتاج ہے، اسی طرح انسان بھی ہر آن اپنے وجود اور اپنی بقا میں، نیز اپنی حرکت اور فعالیت میں فیضِ الٰہی کا محتاج ہے۔ لہٰذا انسان کی طرف سے ہدایت کی طلب اور احتیاج، ایک دائمی طلب اور احتیاج ہے۔ انسان کی طلبِ ہدایت کا یہ دوام اگرچہ ایک تکوینی حقیقت ہے، لیکن خداوند تعالی نے انسان کی اِس طلب کو اُس کی شعوری طلب میں بدلنے کی تعلیم دی ہے۔ اسی لیے ضروری ہے انسان روزانہ کم از کم پانچ نمازوں میں: "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" یعنی: "(اے اللہ!) ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت فرما!" (12) کہہ کر اِس حقیقت پر مہرِ تصدیق ثبت کرے کہ ہدایت کی طلب، اُس کی ایک دائمی طلب ہے۔

پس ایسا نہیں ہے کہ ایک بار ہدایت کے راستے پر آجانے کے بعد انسان ہدایتِ الٰہی کے فیض سے بے نیاز ہو جائے۔ لہٰذا ہدایت کی کوئی طلب اور دعا، یہ معنی و مفہوم نہیں رکھتی کہ انسان پہلے ہدایت یافتہ نہ تھا۔ پس ہدایت یافتہ انسان کو بھی ہر آنے والی آن میں ہدایت کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اگر کہیں اس آیت کے ضمن میں کسی روایت میں طلبِ ہدایت سے مراد، ہدایت کے دوام اور راہ ہدایت پر ثابت قدم رہنے کی بات ہوئی ہے تو یہ بات از خود اس امر کی تائید کرتی ہے کہ انسان کی ہدایت الٰہی کی طلب، ایک دائمی طلب ہے لہٰذا ضروری ہے کہ ہر انسان کو ہر آن خدوند تعالی کی بارگاہ سے ہدایت کا فیض طلب کرنے کیلئے

دست نیاز اٹھائے اور چوبیس گھنٹوں میں کم از کم دس بار اپنی پنجگانہ نمازوں میں ہدایت کی یہ بھیک مانگتے ہوئے اس بات کی تصدیق کرے کہ ہدایت کا فیض دائمی ہے اور یہ خیرات مسلسل بانٹی جارہی ہے۔

3۔ قرآن کریم، کتاب ہدایت

ہدایت کے فیض کے دائمی ہونے پر تیسری اہم دلیل، خود قرآن کریم کا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے کتابِ ہدایت ہونا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالی ہے:

"ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِلْمُتَّقِينَ" (13)

یعنی: "یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں؛ یہ کتاب اہل تقوی کیلئے ہدایت ہے"۔

اگرچہ ہدایت اخذ کرنے کی صلاحیت اور مراتب کے لحاظ سے اِس آیۂ شریفہ میں قرآن کی ہدایت، اہل تقوی کے ساتھ مخصوص ہے، لیکن ہدایت کے فیض اور عطاو بخشش کے لحاظ سے یہ ہدایت، عام اور پوری بشریت کیلئے ہے۔ جیسا کہ ایک اور آیۂ شریفہ میں ارشاد فرماتا ہے:

" شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَ بَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَى وَ الْفُرْقَانِ۔۔۔" (14)

یعنی: " رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو (پوری) انسانیت کیلئے ہدایت ہے اور ایسے دلائل پر مشتمل ہے جو ہدایت اور (حق و باطل کے درمیان واضح) فرق ڈالنے والے ہیں۔"

مذکورہ بالا بحث کا نتیجہ یہ کہ بارگاہ الٰہی سے تمام مخلوقات، بشمول انسان، سب کی ہدایت کا فیض، ایک دائمی فیض ہے اور ہدایت کے فیضِ دوام میں کسی قسم کے شک و شبہ کی قطعی کوئی گنجائش باقی نہیں ہے۔ ہر آن، ہر شئے اور ہر شخص کیلئے ہدایت الٰہی کے فیض پانے کا بندوبست موجود ہے۔ ہاں! کائنات کی دیگر اشیاء کے برعکس، انسان ہدایت الٰہی کے فیض کے اِس جاری و ساری سرچشمے سے فیض پانے یا نہ پانے میں خود صاحبِ اختیار و ارادہ ہے۔ لہٰذا ہدایت کا یہ دائمی فیض کسی طور انسان کے "اختیار" کی نفی نہیں کرتا اور نہ ہی اِس سے "جبر" کا باطل عقیدہ ثابت ہوتا ہے۔

کیونکہ عالم کائنات کی فاقدِ شعور اور اختیار و ارادہ سے عاری اشیاء کے برعکس، انسان کے اختیاری افعال میں اُس کی ہدایت تکوینی (جبری) نہیں، تشریعی (اختیاری) ہے۔ دوسرے الفاظ میں اگرچہ خداوند تعالی

کائنات کی ہر شئے کی مانند، بنی نوع انسان اور ہر انسان کے ہر فعل کا نگہبان ہے، لیکن خدا نے بنی نوع انسان کو اپنے ارادی افعال کی انجام دہی میں دور سے منزل مقصود کی رہنمائی عطا کر کے ہدایت کا راستہ طے کرنے یا نہ کرنے کے حوالے سے اُسے بااختیار بنا دیا ہے:

"إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَبْتَلِيهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيعًا بَصِيرًا إِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا۔۔۔" (15)

یعنی: "بے شک ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا کہ اسے آزمائیں، پس ہم نے اسے سننے والا، دیکھنے والا بنا دیا۔ ہم نے اسے راستے کی ہدایت کر دی؛ خواہ شکر گزار بنے اور خواہ ناشکرا بنے۔۔۔"

ان آیات سے یہ امر روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ بنی نوع انسان بھی الٰہی ہدایت پانے کے دائمی قانون سے خارج نہیں ہے۔ وہ بھی خدا کی مخلوق ہے اور اس کی ہدایت کا بندوبست بھی خدا کرتا ہے؛ لیکن دیگر موجودات عالم سے اُس کا فرق یہ ہے کہ اسے سننے والا اور دیکھنے والا بنایا گیا ہے۔ اس کیلئے امتحان و آزمائش رکھی گئی ہے اور اسے شکر گزای اور ناشکری کا اختیار اور صلاحیت دی گئی ہے۔ اسے میدان دیا گیا ہے؛ چاہے تو ہدایت کے راستے سے منہ موڑ کر کفر اختیار کرے اور اپنی اس سرکشی کے نتیجہ میں زنجیروں میں جکڑا جائے اور بھڑکتی آگ کا مزہ چکھے اور چاہے تو ہدایت کا راستہ طے کرتے ہوئے نیکوکار بن کر بہشتی شراب کے جام پیے۔

پس انسان تخلیق اور ہدایت الٰہی کے کلی قانون کے اندر رہتے ہوئے، ایک بااختیار ہستی ہے۔ لہٰذا اُس کے اختیاری افعال کے بارے میں "اَلْخَيْرُ مِنَ اللّٰهِ وَ الشَّرُّ مِنَ اللّٰه" کا عقیدہ، قرآن کریم کی تعلیمات کے عمیق فہم سے محرومی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ نیز یہ بات عالم ہستی کی دیگر اشیاء کے بارے میں تو صادق ہے کہ "اللہ تعالی کے حکم و امر کے بغیر کوئی برگ نہیں ہلتا" لیکن اِس قاعدے کا اطلاق انسان کے اختیاری افعال پر کسی طور نہیں ہوتا۔

ہدایت کا واسطۂ فیض

خداوند تعالی کی مخلوق مجبور ہو یا مختار، سب ہر آن ہدایت کا فیض پا رہے ہیں؛ لیکن کسی کو یہ فیض، بغیر واسطۂ فیض کے نہیں مل رہا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ہدایت کا دائمی فیض ثابت ہو جائے تو واسطۂ فیض کا دوام خود بخود ثابت ہو جاتا ہے۔ اگر ہم معمولی سی توجہ دیں تو یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ اگر دائمی طور پر پیاس بجھ رہی ہے تو پانی کا واسطہ بھی دائمی طور پر موجود ہے؛ اگر دائمی طور پر فصلیں اگ رہی ہیں تو خاک کا واسطہ بھی دائمی ہے؛ اگر دائمی طور پر پھل لگ رہے ہیں تو درخت کا واسطہ بھی دائمی طور پر موجود ہے اور اگر انسان دائمی طور پر اطاعت اور شکر گزاری کی راہیں طے کر رہا ہے تو راہ حق اور صراطِ مستقیم کی طرف اُس کی ہدایت کا دائمی واسطہ بھی موجود ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ہدایتِ بشر کا یہ واسطہ کیا ہے؟ کون ہے؟ اُس کی پہچان کیا ہے؟ آیا عصرِ حاضر کے انسان کیلئے فیض کا یہ واسطہ ایک ہے یا متعدد واسطے موجود ہیں؟ وغیرہ۔۔۔ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب ڈھونڈنا، ہدایت کے طلبگار ہر انسان کا بنیادی فریضہ ہے۔ ان سوالات کے جواب میں کئی مؤقف، کئی فرضیے اور کئی نظریے قائم کیے جا سکتے ہیں۔ ذیل میں ہم ان سوالات کے جواب میں اپنائے جا سکنے والے ممکنہ مؤقف، فرضیات اور نظریات کا جائزہ لیں گے۔

ا۔ واسطۂ فیض کا انکار

مذکورہ بالا سوالات کے جواب میں ایک مؤقف یہ ہو سکتا ہے کہ ہم سرے سے کسی واسطۂ فیض کے لزوم اور اُس کی ضرورت ہی کے منکر ہو جائیں اور یہ مؤقف اپنا لیں کہ ہدایت بشر کیلئے خدا کی طرف سے کسی واسطۂ فیض کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ لیکن ظاہر سی بات ہے کہ ایسا دعوی کوئی مسلمان نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اگر وہ بنی نوعِ انسان کی الٰہی ہدایت کے تمام واسطوں کا منکر ہو جائے، کم از کم قرآن کریم کے ہدایت الٰہی میں واسطۂ فیض ہونے کا انکار تو نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس امر پر مسلمان امتّ کا اجماع اور اتفاق رائے ہے کہ قرآن کریم، ہر دور کے انسان کیلئے ہدایتِ الٰہی کا ایک اہم واسطہ ہے۔ پس خالصتا علمی نکتۂ نظر سے نہ یہ مؤقف اپنایا جا سکتا ہے اور نہ ہی مسلم امت کا عمل اِس مؤقف کی کوئی تائید کرتا ہے۔ ہر مسلمان کے گھر میں موجود قرآن کریم کے نسخے، ان کی تلاوت اور عملی زندگی میں قرآن کریم سے ہدایت کے حصول کی تگ

و دَو، نیز مسجد و مدرسہ اور شیخ و ملّا اور پیر و مرشد سے ہدایت کی طلب، یہ سب امور، واسطۂ فیض کی ضرورت کے انکار پر واضح خطِ بطلان کھینچتے ہیں۔

۲۔ واسطۂ فیض کا انحصار

واسطۂ فیض کے حوالے سے بنیادی سوالات کے جواب میں دوسرا موٴقف یہ ہو سکتا ہے کہ اگرچہ بنی نوعِ بشر کی ہدایت کیلئے واسطۂ فیض کی ضرورت ہے، لیکن ہدایت الٰہی کے فیض کا یہ واسطہ منحصر ہے۔ البتہ واسطۂ فیض کے انحصار کی آگے چل کر دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

پہلی صورت

یہ کہا جائے کہ ہدایت کے فیض کا واسطہ، قرآن کریم ہیں منحصر ہے اور بس۔ انسانیت کی ہدایت کیلئے اللہ کی کتاب کافی ہے اور کتابُ اللہ کے علاوہ کوئی شئے یا شخص واسطۂ فیض نہیں ہو سکتا۔ یقینا یہ موٴقف اپنانا بھی عقل سلیم کے تقاضوں کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔ کیونکہ اس موٴقف پر کم از کم یہ اشکال وارد ہے کہ ایسا دعوی امت مسلمہ کی عملی سیرت کے سراسر خلاف ہے۔ تاریخِ اسلام میں آیا کوئی دور، ایک دن یا ایک لمحہ ایسا ہے جس میں تنہا قرآن کو ہدایتِ بشر کیلئے کافی قرار دیتے ہوئے مسلمانوں نے ہدایت کے دیگر تمام واسطوں کو پس پشت ڈالا ہو؟ یقینا نہیں۔ علاوہ ازایں، اگر یہ دعوی کیا جائے کہ بنی نوعِ بشر کی ہدایت کیلئے فقط اللہ کی کتاب کافی ہے تو یہ دعوی دو حالتوں سے خارج نہیں ہو سکتا:

۱۔ یا تو یہ دعوی غلط ہوگا۔ اور اگر یہ دعوی غلط ہو تو اس کا مدّمقابل دعوی یعنی یہ کہنا کہ ہدایت کا واسطہ فقط قرآن کریم میں منحصر نہیں ہے، خود بخود ثابت ہو جائے گا۔

۲۔ یا یہ دعوی صحیح ہوگا۔ اگر یہ دعوی صحیح ہو تب بھی اِس کی صحت سے اس کا بطلان لازم آتا ہے۔ یہ دعوی درحقیقت، ایک Self Contradictory (یعنی خود اپنی تکذیب کرنے والا بیان) ہے۔ کیونکہ کسی بھی شخص کی طرف سے یہ دعوی کہ بنی نوعِ انسان کی ہدایت کیلئے تنہا قرآن کافی ہے، خود اپنی جگہ ایک ایسی ہدایت ہے جو قرآن کریم سے نہیں لی گئی بلکہ اُس شخص کے واسطے اور دروازے سے لی جارہی ہے۔ گویا یوں یہ دعوی خود دلیل ہے اس امر کی کہ ہدایت کیلئے قرآن تنہا کافی نہیں ہے۔ اگر قرآن ہدایتِ

بشر کیلئے تنہا کافی ہوتا تو اسے اپنی کفایت ثابت کرنے کیلئے کسی شخص کی فرمائش سے تائید لینے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

پس اس دعوی کا بطلان اتنا واضح ہے کہ اس کے بطلان سے بھی اس کا بطلان ثابت ہوتا ہے اور اس کی صحت سے بھی اس کا بطلان ثابت ہوتا ہے۔ نیز قرآن کریم کی کئی آیات، ہدایت کے عمل میں قرآن کی ضرورت کے ساتھ، قرآن کے معلّم کی ضرورت پر بھی تاکید کرتی ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے:

"الٓرٰ كِتٰبٌ أَنزَلْنٰهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَىٰ صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ۔" (16)

یعنی: "الر، (اے رسول! قرآن) ایک ایسی کتاب ہے جو ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے تاکہ آپ لوگوں کو ان کے ربّ کے اذن سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لائیں؛ غالب آنے والے، ستائش کے لائق اللہ کے راستہ کی طرف۔"

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے:

"وَ مَا اٰتٰىكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا۔" (17)

یعنی: "رسول جو چیز تمہیں دے دیں وہ لے لو اور جس چیز سے روک دیں اس سے رک جاؤ۔"

ایک اور مقام پر ارشاد خداوندی ہے:

"هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيّٖنَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَ يُزَكِّيهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ وَ إِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ۔" (18)

یعنی: "(خدا) وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اُس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاکیزہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے؛ جب کہ اس سے پہلے یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔"

ان آیات اور ان جیسی کئی دیگر آیات سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ قرآن، انسانیت کی ہدایت کیلئے اُس وقت تک کافی نہیں ہے جب تک کہ قرآن کے ساتھ معلمِ قرآن نہ ہو۔ اور قرآن کریم کے سب سے پہلے اور سب سے برتر معلم، حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ لہٰذا خود قرآن کمالِ

صراحت کے ساتھ یہ بیان کرتا ہے کہ اس کی تعلیمات کی روشنی میں لوگوں کو ضلالات و گمراہی کی تاریکیوں سے نکالنا، رسول اکرم (ص) کا کام ہے۔ نیز رسول اکرم (ص) کی تعلیم ہی سے قرآنی ہدایت کی تکمیل و تشریح ہوتی ہے؛ لہٰذا ارشاد فرماتا ہے: ''رسول جو تمہیں دے دیں وہ لے لو اور جس چیز سے روک دیں، اُس سے رُک جاؤ۔'' پس ہدایت کے فیض کا واسطہ فقط قرآن کریم میں منحصر نہیں ہے اور قرآن میں واسطۂ فیض کے انحصار کا موٴقف بھی اتنا ہی باطل اور خلاف حقیقت ہے جتنا واسطۂ فیض کا انکار باطل اور خلافِ حقیقت موٴقف ہے۔

دوسری صورت

واسطۂ فیض کے انحصار کی دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ یہ کہا جائے کہ ہدایتِ الٰہی کے فیض کا واسطہ قرآن کریم اور نبی اکرم (ص) کی تعلیم میں منحصر ہے اور ہدایتِ بشر کیلئے اللہ کی کتاب اور رسول اللہ کی تعلیم (سنّت) کافی ہیں۔ لیکن واسطۂ فیض کے انحصار کی یہ دوسری صورت بھی اتنی ہی نادرست ہے جتنی اس کی پہلی صورت نادرست تھی۔

اس موٴقف کی نادرستی پر بھی سب سے پہلی دلیل تو امتِ مسلمہ کا عملی اجماع ہے۔ اِس امت کے سب فرقوں کے دینی رہنماؤں نے قرآن و سنت کو ہدایت بشر کیلئے کافی نہیں سمجھا اور سب نے اس فیض کو امت کے افراد تک پہنچانے میں خود واسطہ بن کر اپنا اپنا حصہ ڈالا ہے۔ کسی نے محدّث بن کر، کسی نے مفسّر بن کر، کسی نے فقیہ بن کر اور کسی نے متکلم بن کر۔ کوئی عالمِ دین قرآن و سنت کو ہدایتِ بشر کیلئے کافی نہیں سمجھتا بلکہ ہر عالم دین اور عالم نما، قرآن اور عام انسانوں کے درمیان واسطۂ فیض بن کر قرآن سے اپنے فہم کو تفسیر کے نام پر پیش کرتا ہے اور سنّت اور عام انسانوں کے درمیان خود ہدایت کا واسطۂ فیض بن کر فقیہ و امام بن کر فقہ و احکام اور اخلاق و سیاست کی تدوین کرتا ہے۔ کہیں ''خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں' اور کہیں ''خود بدلتے نہیں، نبی اکرم (ص) کے فرماں کو بدل دیتے ہیں۔''

اگر ہدایتِ بشر کیلئے تنہا قرآن اور سنّت نبوی کافی ہے تو فقہ و تفسیر اور کلام و عقائد کی تمام کتابیں دریا برد کرنا پڑیں گی؛ کیونکہ یہ سب واسطے ہیں۔ نیز تمام ائمہ تفسیر اور فقہ کی چھٹی کرانا پڑے گی، کیونکہ اِن سب نے ہر قسم کی خطا اور لغزش اور تحریف سے پاک قرآن کریم سے اپنے غیر معصوم فہم کو لوگوں کیلئے حجت و

دلیل بنا کر پیش کیا ہے اور پیغمبر اکرم (ص) کی قطعی سنت میں بھی من پسند تبدیلیاں، تحریفات، جعل اور جرح و تعدیل کے اپنے اپنے پیمانے وضع کر کے سنتِ نبوی سے اپنے ناقص فہم کو فقہ اور احکام بنا کر لوگوں کیلئے حجت اور دلیل اور ہدایتِ الٰہی کے طور پر پیش کیا ہے۔

اگر دعوی یہ ہے کہ اللہ تعالی کی کتاب اور رسول اللہ (ص) کی سنت کافی ہے تو ان سب واسطوں کو درمیان سے نکال دو اور اللہ کی مخلوق اور اللہ کی کتاب اور رسول اللہ (ص) کی سنت کے درمیان واسطہ نہ بنو۔ ہاں! اگر یہ نہیں ہو سکتا تو پھر مان لو کہ ہدایتِ بشر کیلئے اللہ کی کتاب اور رسول اللہ کی سنت تنہا کافی نہیں ہیں بلکہ ان کے ہمراہ کچھ دیگر واسطوں کی بھی ضرورت ہے جو ہدایت الٰہی کی ہمیشہ جاری چشمے سے رُلالِ ہدایت کے پاک و پاکیزہ ساغر اور جام بھر کر تشنۂ ہدایت انسانیت کو سیراب کر سکیں۔ یقینا یہی موقف درست ہے۔ اور اس موقف پر امت مسلمہ کے عملی اجماع کے علاوہ بھی کئی دلائل و براہین موجود ہیں۔

پس مذکورہ بالا بحث کا خلاصہ یہ کہ بنی نوع انسان کی ہدایت کیلئے اللہ تعالی نے جہاں ہدایت کا فیض، عام اور دائمی رکھا ہے، وہاں ہدایت کے فیض کے واسطوں کا بھی دائمی بندوبست کر دیا ہے۔ اگرچہ نبی اکرم (ص) کی رحلت پر نبوّت کا دروازہ بند ہوا اور ہدایت الٰہی کا یہ واسطہ منقطع ہوا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ پوری انسانیت ہدایت کے فیض سے فیضیاب ہو چکی اور اب کسی الٰہی ہادیِ برحق کی ضرورت نہیں رہی۔ اور نہ ہی اس کا مطلب یہ ہے کہ ہدایت بشر کیلئے آسمانی کتابوں کے نزول کا سلسلہ رک جانے اور نبوت کے خاتمے کے بعد ہدایتِ بشر کیلئے اب کسی انسانِ کامل کی رہنمائی کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی۔

لیکن یہاں ایک اہم پیچیدگی یہ درپیش ہے کہ کتابُ اللہ اور رسولُ اللہ کی سنت کے بعد گویا پانی گدلا ہو جاتا ہے اور یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کتابُ اللہ اور رسولُ اللہ کے بعد ہدایت الٰہی کا یہ فیضِ عام، کن واسطوں سے گذر کر بنی نوعِ انسان تک پہنچنا چاہیے۔ یہاں کئی انتہائی اہم سوالات جنم لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ سوال کہ عصر نبوت کے بعد کے انسان کیلئے ہدایت الٰہی کا سلسلہ کس شکل و صورت میں جاری ہے اور ہدایت کا دائمی فیض، کن سرچشموں سے میسر ہے؟ یا یہ سوال کہ نبی اکرم (ص) کے بعد ہدایتِ الٰہی میں واسطۂ فیض کون ہے؟ آیا جسے ارباب حل و عقد منتخب کر لیں؟ آیا مسندِ رسول (ص) پر بیٹھنے والے جسے معین

کر دیں؟ آیا جس کا انتخاب کسی شوریٰ کے ذریعے کر لیا جائے؟ آیا جس کے ہاتھ پر عام مسلمان بیعت کر لیں؟ آیا جو کسی خاص قبیلے سے تعلق رکھتا ہو؟ آیا جو کسی سلطان کا بیٹا ہو؟ آیا وہ جس نے صرف و نحو اور ناظرہ و تجوید، نیز فقہ و حدیث کا دورہ کر لیا ہو؟ آیا مفسّر یا محدّث، متکلم یا فلسفی؟ مؤرخ یا مجتہد؟ خلاصہ یہ کہ ہدایت الٰہی کے فیض میں واسطۂ فیض بننے کا کوئی معیار ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو وہ معیار کیا ہے؟

یہاں جب تک کوئی واضح معیار اخذ نہ کر لیا جائے، اس واسطۂ فیض کو تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا ہم مجبور ہیں یہاں کوئی قابل قبول معیار قائم کریں اور پھر یہ دیکھیں کہ اُس معیار پر کون پورا اترتا ہے؟ واضح سی بات ہے کہ جو بھی اُس معیار پر پورا اترے گا، اسے ہدایت الٰہی میں واسطۂ فیض کے طور پر مان لیا جائے گا اور جو بھی اس معیار پر پورا نہیں اترے گا، اسے ہدایتِ الٰہی کے واسطوں کی فہرست سے نکال باہر کرنا ہو گا۔

ہدایت کے واسطۂ فیض کا معیار

یہاں ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہو گا کہ خداوند عالم نے آسمانی ہدایت کے عمل میں کن اشیاء اور کن اشخاص کو ہدایت کے فیض کا واسطہ قرار دیا ہے اور اس حوالے سے الٰہی سنت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب قرآن کریم کی آیات کی روشنی میں بڑی آسانی سے دریافت کیا جا سکتا ہے۔ ہاں! اس جواب تک پہنچنے کی تنہا شرط یہ ہے کہ انسان اپنے بشری فہم کو خالص رکھے، اُس پر بھروسہ کرے، اُس میں گمراہ کن تأویلات کو نہ گھسنے دے اور نہ ہی اُس میں کسی کھوٹ کو شامل ہونے دے۔ اگر اُس نے خالصانہ تگ و دَو کی تو وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ ہدایت الٰہی کے فیض کا واسطہ، تنہا وہی شخص یا شئے ہو سکتی ہے جس میں دو خصوصیات پائی جاتی ہوں:

۱) الٰہی انتخاب

ہدایت الٰہی کے فیض کا واسطہ، تنہا وہی شخص یا شئے ہو سکتی ہے جسے ہدایت کے واسطہ کے طور پر خود خدائے بزرگ و برتر نے انتخاب فرمایا ہو۔ اس حوالے سے قرآن کریم کی آیات اتنی صریح ہیں کہ ان میں کوئی ابہام باقی نہیں رہ جاتا۔ قرآن کریم کی آیات کی روشنی میں یہ بات واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ ہدایت الٰہی کا سب سے پہلا واسطہ، آسمانی کُتب اور انبیائے الٰہی ہیں۔ جہاں تک آسمانی کتب کا تعلق ہے تو اُن میں

سے کوئی کتاب بھی بشری تالیف نہیں ہے، بلکہ یہ سب کتابیں خود خداوند تعالی نے نازل فرمائی ہوئی ہیں۔ (البتہ یہ ان کتب کی بات ہے جو ہر قسم کی تحریف سے پاک ہیں یا تھیں) آسمانی کتب کے مضامین اور الفاظ کے چناؤ اور اِن کتب کی بنی نوعِ بشر کی طرف ترسیل کے عمل کو قرآن کریم نے فقط خدا کی طرف نسبت دی ہے اور اس عمل میں خدا کے علاوہ کسی کی شراکت کا قائل نہیں ہے۔

قرآن کریم کی کم از کم پانچ آیات میں آسمانی کتب کے متون کے مضامین اور الفاظ کے چناؤ اور اِن کتب کی بنی نوعِ بشر کی طرف ترسیل کے عمل کو قرآن کریم نے "نَزَّلَ" یا "نزّلنا" جیسے کلمات سے تعبیر کیا ہے (19) اور "نَزَّلَ" کا فاعل فقط خدا کو قرار دیا ہے۔ اسی طرح لگ بھگ دس آیات میں ہدایت بشر کے نصاب کی تعیین اور ترسیل کے عمل کو "أَنْزَلَ" کلمے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (20)

اِن آیات میں بھی "أَنْزَلَ" کا فاعل فقط خدا ہے۔ نیز کم از کم آٹھ آیات میں اس عمل کو "أَنزَلْنَا" کے کلمہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (21)

ان سب آیات میں متکلم وحدہ خود خداوند تعالی کی ذات ہے۔ اس عمل کو کم و بیش ۱۹ آیات میں "آتَيْنَا"، "اٰتَينٰهما"، "اٰتٰنِیَ" یا "آتَيْنَاهُمْ" کے کلمے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (22)

اور یہاں بھی اس کام کا فاعل تنہا خدا ہے۔ اس کے علاوہ لگ بھگ ۱۱ آیات میں ہدایتِ بشر کے نصاب کی تدوین اور ترسیل کے اس عمل کو "تنزیل"؛ "مُنَزَّلٌ"، "أوحینا"، "أورثنا"، "جعلناہ"، "یسّرنا" اور "مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ" کی تعبیرات کے ذریعے بیان فرما کر (23)

اس امر کو ناقابلِ تردید بنا دیا گیا ہے کہ ہدایت بشر کے عمل میں تنہا وہی آسمانی کتابیں ذریعہ اور وسیلہ بن سکتی ہیں جنہیں خود خداوند تعالی نے ہدایتِ بشر کا وسیلہ اور واسطہ قرار دیا ہے۔ مزید برایں، بعض دیگر آیات میں بھی اس امر پر مزید تاکید کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل آیت میں ارشاد فرماتا ہے:

"هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ" (24)

یعنی: "خدا ہی ہے جس نے آپ پر کتاب نازل کی۔"

اس آیۂ شریفہ میں کتاب کے نازل کرنے والے کو فقط خدا کی ذات میں منحصر کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح بعض آیات میں تو یہ کام انسانوں اور جنات کی طاقت سے بھی باہر قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتا ہے:

"قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلَىٰ أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا (25)

یعنی: (اے رسول!) کہہ دیجئے اگر انسان اور جن سب مل کر اس قرآن کی مانند لانا چاہیں تو نہیں لا سکتے؛ خواہ وہ اس کام میں ایک دوسرے کا ہاتھ بھی کیوں نہ بٹائیں۔"

اس آیت سے نہ فقط قرآن کی معجزانہ حیثیت ثابت ہوتی ہے، بلکہ اِس سے یہ مطلب بھی قابلِ استفادہ ہے کہ ہدایت بشر کا کوئی نصاب آمادہ کرنا، جن وانس کے بس کا روگ ہے ہی نہیں۔ بلکہ عام انسان تو کجا یہ کام انبیاء کے بس کا روگ بھی نہیں ہے۔ چنانچہ بعض آیات میں اس شائبہ کی بھی بڑی سختی سے نفی کر دی گئی ہے کہ ہدایت بشر کے متن کی آمادہ سازی میں نبی اکرم (ص) کو بھی ذرہ برابر عمل دخل حاصل نہیں ہے؛ بلکہ اگر بفرض محال، اشرف الانبیاء نبی بھی ایسا کرنے کا سوچ لیں اور اپنے بعض فرمودات کو ہدایتِ بشر کے الٰہی متن میں گھسیڑنا چاہیں تو اُن کی شہ رگِ حیات کاٹ دی جائے:

"تَنْزِيلٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَ لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ (26)

یعنی: یہ (کلام) عالمین کے پروردگار کی طرف سے نازل کردہ ہے؛ اور اگر اس (نبی) نے کوئی بات بھی گھڑ کر ہماری طرف منسوب کی ہوتی تو ہم اسے دائیں ہاتھ سے پکڑ لیتے؛ پھر اس کی شہ رگ کاٹ دیتے۔ پھر تم میں کوئی مجھے اس سے روکنے والا نہ ہو۔"

پس قرآن کریم کی اُن پچاس، پچپن آیات کی روشنی میں جن کی طرف اوپر اشارہ ہوا، بنی نوع انسان کی ہدایت کے پہلے واسطۂ فیض، یعنی دینی تعلیمات، کورس اور متن کی تعیین، فقط اور فقط خدا کا کام ہے۔ اور اِس حقیقت پر نہ فقط اوپر بیان شدہ آیات، بلکہ وہ آیات بھی دلالت کرتی ہیں جن میں ہدایت بشر کیلئے الٰہی تعلیمات کو "شریعت" کی حیثیت سے پیش کرنے کی بات ہوئی ہے۔ لہٰذا قرآن کریم میں یہ تصریح موجود ہے کہ شریعت اور انسانیت کیلئے زندگی کا سفر طے کرنے کا راستہ، خدا نے معین کرنا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتا ہے:

"۔۔۔ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَ مِنْهَاجًا ۔۔۔" (27)

یعنی: "ہم نے تم میں سے ہر ایک (امت) کیلئے ایک دستور بنایا ہے۔۔۔"

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ خداوند تعالی نے ہر امت کیلئے ایک دستور بنایا ہے جسے "شرعہ" یا "شریعت" کا نام دیا گیا ہے اور دستور سازی کے معاملے میں کوئی خدا کا شریک نہیں ہو سکتا:

"شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَ مَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَ مُوسَى وَ عِيسَى أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ۔۔۔" (28)

یعنی: "اس نے تمہارے لیے دین کا وہی دستور معین کیا جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جس کی ہم نے آپ کو وحی کی اور جس کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا کہ اس دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔۔۔"

نیز ایک اور مقام پر اس امر پر تنبیہ کی گئی ہے کہ خدا کے اذن و اجازت کے بغیر کسی کو کوئی شریعت گھڑنے کا حق حاصل نہیں ہے:

"أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُمْ مِنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ اللهُ۔۔۔" (29)

یعنی: "کیا اُن کے پاس ایسے شریک ہیں جنہوں نے ان کے دین کا ایسا دستور فراہم کیا ہے جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی؟"

لہٰذا دین و شریعت، انبیاء کا گھڑا ہوا نہیں ہے، بلکہ یہ تو ہدایتِ بشر کا الٰہی سامان ہے جس کا بندوبست خود خدا فرماتا ہے:

"ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَى شَرِيعَةٍ مِنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَ لَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ"

یعنی: "پھر ہم نے آپ کو امر کی ایک خاص شریعت پر قائم کیا، لہٰذا آپ اسی پر چلتے رہیں اور نادانوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلیں۔" (30)

"وَ وَصَّى بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَ يَعْقُوبُ يَا بَنِيَّ إِنَّ اللهَ اصْطَفَى لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ (31)

[۳۱] یعنی: ” اور ابراہیم نے اپنی اولاد کو اسی ملت (دین) پر چلنے کی وصیت کی اور یعقوب نے بھی (اپنی اولاد کو یہی وصیت کی) کہ اے میرے بیٹو! اللہ نے تمہارے لیے یہی دین پسند کیا ہے؛ لہٰذا تم تادم مرگ اسی دین کے سامنے سر تسلیم خم رکھنا۔“

پس ان آیات کی روشنی میں اس حقیقت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ بنی نوع انسان کی ہدایت کا کوئی متن، خدا کے سوا کوئی معین نہیں کر سکتا۔ جب ہدایت کا فیض خدا کی طرف سے ہے تو اس فیض کا واسطہ بھی خدا کا معین کردہ ہوگا۔ اور نہ فقط ہدایت بشر کا متن معین کرنا خدا کے علاوہ کسی کا کام نہیں ہے بلکہ انسانیت کی ہدایت کے دوسرے واسطۂ فیض، یعنی انبیاء و رُسل کی تعیین بھی فقط اور فقط خدائے بزرگ و برتر کا کام ہے۔ قطعاً خدا کے علاوہ کسی کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے اور نہ کسی میں یہ لیاقت اور شائستگی پائی جاتی ہے کہ ہادیانِ برحق کی تشخیص دے سکے یا انہیں معین کر سکے۔ اس حوالے سے بھی قرآن کریم کی آیات میں اس قدر صراحت پائی جاتی ہے کہ کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔

حقیقت یہ ہے کہ خداوند تعالی نے انسانیت کی ہدایت اور انہیں آسمانی کتب کی تعلیم دینے کیلئے پانچ بڑے منصب قرار دیے ہیں اور اِن مناصب میں سے کسی منصب پر بھی شائستہ فرد کی تعیین کا حق فقط اور فقط خداوند تعالی کے پاس محفوظ ہے اور کسی جن و انس کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ آسمانی تعلیمات کے معلم کا از خود انتخاب کریں۔ قرآن کریم کی کم و بیش تیرہ آیات کی روشنی میں یہ پانچ بڑے منصب عبارت ہیں خلافت، رسالت، نبوت، امامت اور وزارت یا نیابت سے۔ لہٰذا جہاں تک خلافت کا تعلق ہے تو اس حوالے سے ارشاد باری تعالی ہے:

”وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً“ (32)

یعنی: ”اس وقت کو یاد رکھیے جب تمہارے پروردگار نے ملائکہ سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ معیّن کر رہا ہوں۔“

یا ایک اور آیۂ شریفہ میں ارشاد باری تعالی ہے:

”يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ“ (33)

یعنی: " اے داؤد! بے شک ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ معیّن کیا ہے۔"

جہاں تک رسالت کے منصب کا تعلق ہے تو اس حوالے سے بھی قرآن کریم کی آیات بڑی صریح ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم منکرین قرآن کے اس زعم باطل پر خطِ بطلان کھینچتا ہے کہ وہ بھی رسولوں کے ہم منصب ہو سکتے ہیں اور جو مقامات اور وحی والہامات رسولوں کو عطا کیے گئے ہیں، انہیں بھی عطا ہو سکتے ہیں:

" وَإِذَا جَاءَتْهُمْ آيَةٌ قَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ حَتَّى نُؤْتَىٰ مِثْلَ مَا أُوتِيَ رُسُلُ اللهِ اللهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ۔۔۔" (34)

یعنی: " اور جب کوئی آیت ان کے پاس آتی ہے تو کہتے ہیں: ہم ہر گز اس وقت تک نہیں مانیں گے جب تک ہمیں بھی وہ چیز نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی گئی ہے؛ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کسے رسالت کے منصب پر فائز کرے۔۔۔"

اس آیۂ شریفہ میں بنی نوع بشر کے نہ فقط اس گمان کو ردّ کیا گیا ہے کہ ہر انسان کو وہ کچھ عطا کیا جا سکتا ہے جو انبیاء کو عطا کیا جاتا ہے بلکہ ساتھ یہ وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ انبیاء کے مقامات پانا تو درکنار، انبیاء کی تعیین بھی انسان کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کی ترجمانی اُس الہام الٰہی کے بیان میں بھی کر دی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں کو ہوا:

"إِنَّا رَآدُّوهُ إِلَيْكِ وَجَاعِلُوهُ مِنَ الْمُرْسَلِينَ" (35)

یعنی: " (اے موسیٰ کی ماں!) ہم موسیٰ کو آپ کی طرف لوٹا دیں گے اور انہیں رسولوں میں سے ایک رسول معین کریں گے۔"

نیز خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب رسالت کا منصب ملا تو یہاں آپ سے ان الفاظ میں خطاب ہوا:

"وَأَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحَىٰ" (36)

یعنی: " (اے موسیٰ!) میں نے (رسالت کے منصب کیلئے) تیرا انتخاب کیا ہے، لہٰذا جو وحی کی جا رہی ہے اُسے (غور سے) سنو۔"

جہاں تک نبوت کے منصب کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں بھی قرآنی تعلیمات بڑی واضح ہیں۔ چنانچہ اس حوالے سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی ارشاد الٰہی ہے:

"قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللهِ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا" (37)

یعنی: "عیسیٰ نے کہا: یقینا میں خدا کا بندہ ہوں؛ خدا نے مجھے کتاب دی ہے اور اُسی نے مجھے نبی بنایا ہے۔"

بعض دیگر آیات میں دیگر انبیاء کے حوالے سے یہی کلیہ قاعدہ سامنے آتا ہے کہ نبوت کے منصب پر کسی کا انتخاب، فقط خدائے ذوالجلال کا کام ہے۔ اس حوالے سے ارشاد فرماتا ہے:

"فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللهِ وَهَبْنَا لَهُ إِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا۔" (38)

یعنی: "پھر جب ابراہیم (ع) نے انہیں اور ان بتوں سے کنارہ کشی کر لی جنہیں اوہ اللہ کو چھوڑ کر پوجا کرتے تھے تو ہم نے انہیں اسحاق اور یعقوب عطا کیے اور ہم نے سب کو نبی بنایا۔"

جہاں تک امامت کے عہدے کا تعلق ہے تو اس حوالے سے بھی قرآن کریم کی منطق یہی ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ارشاد فرماتا ہے:

"وَإِذِ ابْتَلَى إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمٰتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِينَ۔" (39)

یعنی: "اور (وہ وقت یاد رکھو) جب ابراہیم کو ان کے پروردگار نے چند کلمات سے آزمایا اور انہوں نے انہیں پورا کرکے دکھایا۔ ارشاد ہوا: میں تمہیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔ انہوں نے کہا: اور میری اولاد سے بھی؟ ارشاد ہوا: میرا عہد ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔"

اس حوالے سے ذیل کی دو آیات بھی ملاحظہ فرمایئے:

"وَجَعَلْنٰهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا" (40)

یعنی: "اور ہم نے اِن (انبیاء) کو امام بنایا جو ہمارے حکم کے مطابق رہنمائی کرتے تھے۔"

"وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا" (41)

یعنی: "اور ہم نے ان (انبیاء) میں سے کچھ کو امام بنایا جو ہمارے حکم کے مطابق رہنمائی کرتے تھے۔"

باقی رہا وزارت اور نیابت کا معاملہ، تو اس حوالے سے بھی قرآن کریم کا موٴقف بڑا واضح ہے۔ یہ منصب بھی فقط خدا کے ہاتھوں میں ہے اور اس منصب کیلئے کسی کا تقرر بھی فقط خدا کا کام ہے۔ چنانچہ جب حضرت موسی (ع) کو حکم ہوا کہ فرعون کے پاس جاؤ اور اسے حق کی دعوت دو تو انہوں نے بارگاہ الٰہی میں عرض کی:

"قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِی صَدْرِی۔۔۔ وَ اجْعَلْ لِی وَزِیرًا مِنْ أَهْلِی هَارُونَ أَخِی۔۔۔ قَالَ قَدْ أُوتِیتَ سُؤْلَكَ یَامُوسَی" (42)

یعنی: "فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ طغیان گر بن چکا ہے۔ عرض کی: بارالہا! میرا سینہ کھول دے۔۔۔ اور میرے خاندان سے میرا وزیر بنا، میرے بھائی ہارون کو۔۔۔ ارشاد ہوا: اے موسیٰ تیری حاجت روا کر دی گئی ہے۔"

یہاں حضرت موسیٰ (ع) اپنے وزیر کی تعیین کا تقاضا خداوند تعالی سے کر رہے ہیں۔ اور یہ امر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ نبی کا وزیر بنانا، خدا کا کام ہے اور جب تک تائید الٰہی نہ آجائے حضرت موسیٰ بھی حضرت ہارون کو اپنا وزیر قرار نہیں دے سکتے۔ حتی کہ نبی اکرم (ص) کو بھی رسالت کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے میں ایک مددگار کی طلب کا تقاضا کرنے کی تعلیم دی گئی:

"قُلْ رَبِّ۔۔۔ وَاجْعَلْ لِی مِن لَّدُنْكَ سُلْطَاناً نَصِیراً۔ (43)

یعنی: "کہہ دیجئے! اے پالنے والے۔۔۔ اور میرے لیے اپنے ہاں سے ایک قوت (حجت و برہان) عطا فرما جو میرا مددگار ثابت ہو۔"

ایک اور آیۂ شریفہ میں آدم و نوح اور آل ابراہیم و آل عمران، سب کے انتخاب کو خود خداوند تعالی کے اختیار میں دیا گیا ہے:

"إِنَّ اللهَ اصْطَفَیٰ آدَمَ وَ نُوحًا وَ آلَ إِبْرَاهِیمَ وَ آلَ عِمْرَانَ عَلَی الْعَالَمِینَ۔" (44)

یعنی: "بے شک اللہ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کا تمام عالمین پر انتخاب فرمایا ہے۔"

ایک اور مقام پر ہادیان برحق کے انتخاب کے حوالے سے ارشاد فرماتا ہے:

"وَ رَبُّكَ یَخْلُقُ مَا یَشَاءُ وَ یَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ سُبْحَانَ اللهِ وَ تَعَالَی عَمَّا یُشْرِكُونَ۔" (45)

یعنی: ''اور تیرا پروردگار جو چاہتا ہے خلق کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے انتخاب کرتا ہے؛ انہیں انتخاب کا کوئی حق حاصل نہیں ہے؛ اللہ پاک ہے اور بلند و برتر ہے اُس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔''

اس آیت میں بھی مشرکین کی طرف سے بتوں کو وسیلہ اور واسطہ قرار دیے جانے کی مذمت اور ایک کلی قانون پیش کیا جا رہا ہے کہ تشریع و قانون سازی اور خدا کے لطف اور فیض کا کوئی واسطہ لوگ اپنی طرف سے نہیں تراش سکتے؛ بلکہ تخلیق اور انتخاب، یہ دونوں خدا کے کام ہیں۔ بنابرایں، قرآن کریم کی کم و بیش ۱۳۱ آیات ''انّی جاعل'' (میں بنا رہا ہوں)، ''انّا جعلناك'' (بے شک ہم نے تمہیں بنایا ہے)، ''جعلنی'' (خدا نے مجھے بنایا ہے) اور ''جاعلك'' (میں تمہیں بنا رہا ہوں) ''اِنَا اخْتَرتُكَ'' (تحقیق میں نے ہی تیرا انتخاب کیا ہے) جیسی مکرر تصریحات اس امر پر تاکید کر رہی ہیں کہ ہدایت الٰہی کے فیض کے واسطہ یعنی انبیاء و رسل، اُن کے نائبین، جانشین اور وزیر، خلاصہ ہادیان برحق کی تعیین، فقط اور فقط خدائے ذوالجلال کا کام ہے۔ اور نبوت ہو یا رسالت، جانشینی ہو یا امامت، یہ سب منصب، خدا کا انتخاب ہیں، نہ کسی کے ''سماجی نبوغ'' کا مظہر اور نہ ہی کسی نابغۂ روزگار کے دل و دماغ سے ترشح پانے والے خود ساختہ افکار و نظریات کے طفیل ملنے والے سوشل کیرئیر۔ نیز دین بھی ہدایت بشر کیلئے خدا کا معین کردہ نصاب ہے، نہ کسی سیاست دان یا مصلح و مجدّد کا معاشرتی اصلاحات کا ایجنڈا۔

پس ہدایت الٰہی کے فیض کا واسطہ، وہی اشیاء اور اشخاص بن سکتے ہیں جنہیں خود خدا نے واسطہ قرار دیا ہو۔ لہٰذا چند اہل حل و عقد کا انتخاب شدہ کوئی شخص، کسی فرد واحد کی طرف سے معین کردہ شخص، کسی شوری کی طرف سے چن لیا گیا کوئی فرد اور مختلف حیلوں بہانوں سے بیعت لے لینے والا کوئی فرد، سب فضائل کا مالک تو ہو سکتا ہے لیکن قطعاً ہدایت الٰہی کے فیضِ دائم میں واسطۂ فیض قرار نہیں پا سکتا اور نہ ہی اُس کے دروازے سے گمراہوں کو کوئی ہدایت و رہنمائی مل سکتی ہے۔

۲) عصمت

ہدایت الٰہی کے فیض کے واسطہ کی تشخیص کا دوسرا معیار یا دوسری بڑی خصوصیت جو قرآن کریم کی آیات کی روشنی میں سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ جس واسطے سے ہدایت کا فیض پہنچتا ہے وہ واسطہ ہر قسم کی آلودگی اور

خطا و لغزش سے پاک ہونا چاہیے تاکہ ہدایت الٰہی کا پاک و پاکیزہ فیض، اپنی خالص حالت میں بنی نوعِ بشر تک پہنچ سکے اور کسی واسطے کی آلودگی، خطا یا لغزش، فیضِ ہدایت کو آلودہ نہ کر دے۔ واسطۂ فیض کی اس خصوصیت کا نام اصطلاحاً "عصمت" ہے۔ لہٰذا یہ نہیں ہو سکتا کہ خداوند تعالی نے اپنی دائمی ہدایت کیلئے جن واسطوں کا انتخاب فرمایا ہے وہ ہدایت کے عمل میں خطا و لغزش کا شکار ہو جائیں۔ کیونکہ اگر واسطۂ فیض میں خطا و لغزش کا امکان بھی پایا جاتا ہو تو ہدایتِ الٰہی کا سارا سلسلہ نا قابل اعتماد اور بے فائدہ ہو جائے گا اور یہ امر، ہدایت الٰہی کے کلی قاعدہ کے خلاف ہے۔

ہدایت الٰہی کے حوالے سے کلی قاعدہ یہی ہے کہ اس میں خطا و لغزش کا امکان تک نہیں ہے۔ نہ خدا کی تکوینی ہدایت میں کوئی خطا و لغزش ہے اور نہ ہی اس کی تشریعی ہدایت میں کوئی سہو و خطا ہے۔ اگر ہم عالم کائنات میں خدا کی تکوینی ہدایت پر ایک نظر دوڑائیں تو بڑی آسانی سے اس حقیقت کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ عالم کائنات میں ہم نے کبھی اس غلطی یا سہو و عصیان کا مشاہدہ نہیں کیا کہ کھجور کی گٹھلی سے آم کا درخت اگ آئے اور شیشم کا درخت بیری کا پھل دینے لگے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ گندم بونے پر گنے کی فصل اُگے اور گنا کاشت کرنے پر جَو کی فصل کھڑی ہو جائے۔ خدا کی تکوینی ہدایت میں کہیں کوئی غلطی نہیں ہے؛ لہٰذا نہ سورج، چاند کے مدار میں داخل ہو سکتا ہے، نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے:

"لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ۔" (46)

یعنی: "نہ سورج کیلئے مناسب ہے کہ وہ چاند کو پکڑ لے اور نہ ہی رات دن پر سبقت لے سکتی ہے۔ سب اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔"

"۔۔۔ مَا تَرَى فِي خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفَاوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَى مِنْ فُطُورٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ۔"

یعنی: "۔۔۔ تم رحمٰن کی تخلیق میں کوئی بد نظمی نہیں دیکھو گے؛ ذرا پھر پلٹ کر دیکھو! کیا تم کہیں کوئی خلل پاتے ہو؟ پھر پلٹ کر دوبارہ دیکھو! تمہاری نگاہ ناکام ہو کر تھک کر تمہاری طرف لوٹ آئے گی۔ (لیکن تمہیں کہیں کوئی بگاڑ نظر نہیں آئے گا)" (47)

خداوند عالم، عالمِ تکوین میں ہر شئے کی ایسی ہدایت کر رہا ہے جس میں کوئی خطا اور لغزش نہیں ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ عالم ہستی اسی ہدایت الٰہی کے طفیل ہر قسم کے فساد اور تباہی سے محفوظ ہے اور اس میں کہیں کوئی بگاڑ نہیں ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ اور ہر پرزہ، عین اپنی راہ پر لگا ہوا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہدایت الٰہی کی جوئے رواں ہر قسم کی آلودگی سے پاک بہتی چلی آرہی ہے اور کائنات کے ہر ذرے کو سیراب کر رہی ہے۔

اگر کائنات کی ہر شئے کیلئے ہدایت الٰہی کا یہ ساماں اتنا پاک و پاکیزہ اور ہر قسم کی خطا و لغزش اور غفلت و نسیان سے محفوظ ہے تو یہ کیسے ہو سکتا کہ ہدایتِ الٰہی کا یہ فیضِ رُلال جب عالم انسانیت کو سیراب کرنے لگے تو آلودہ ہو جائے؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ انسان کی ہدایت بھی تکوینی ہے؛ یہ الگ بات ہے کہ صرف انسانی اختیار کے عنصر کے آجانے کے سبب اسی تکوینی ہدایت کا نام ''تشریع'' پڑ جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک دریا کے پانی کو جب اس سے نکالی جانے والی کسی نہر، نالے میں ڈال دیا جائے تو اس کا نام بدل جاتا ہے اور یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ دریا بہہ رہا ہے بلکہ یہ کہا جانے لگتا ہے کہ ندی، نالا بہہ رہا ہے۔ حالانکہ اب بھی پانی، اسی دریا کا پانی ہوتا ہے۔ اگر دریا پاک و پاکیزہ ہے، تو یہ ندی نالا بھی پاک و پاکیزہ ہو گا۔ لہٰذا تشریعی ہدایت بھی درحقیقت، تکوینی ہدایت ہی ہے اور جس طرح تکوین میں خطا و لغزش محال ہے، تشریع میں بھی خطا و لغزش محال ہے۔ جس طرح عالم تکوین میں کوئی بگاڑ اور شگاف نہیں ہے، اسی طرح عالم تشریع میں بھی کوئی بگاڑ اور شگاف نہیں ہونا چاہیے۔

اس حوالے سے تفسیر المیزان میں علامہ طباطبائی کا یہ فرمان انتہائی قابل غور ہے جہاں آپ لکھتے ہیں:

'' فان السبب الذی اوجب وجود الانسان فی الخارج وجودا حقیقیا کسائر الانواع الخارجیة هو الذی یهدیه هدایة تکوینیة خارجیة الی سعادته؛ و من المعلوم ان الامور الخارجیة من حیث انها خارجیة لاتعرضها الخطاء و الغلط، اعنی الوجود الخارجی لا یوجد فیه ۔۔۔ و اذا فرض ان الذی یهدی هذا النوع الی سعادته و رفع اختلافه العارض علی اجتماعه هو الایجاد و التکوین، لزم ان لایعرضه غلط و لا خطأ فی هدایته و لا فی وسیلة هدایته التی هی روح النبوة و شعور الوحی۔۔۔''(48)

یعنی: " جس سبب نے عالم خارج میں انسان کے وجود کو دیگر خارجی انواع کے وجود کی مانند، ایک حقیقی وجود قرار دیا ہے، وہی سبب انسان کو اُس کی سعادت کی تکوینی اور خارجی ہدایت عطا کرتا ہے۔ اور یہ بات سب پر عیاں ہے کہ خارجی امور سے اُن کے خارجی ہونے کے لحاظ سے کوئی خطا اور غلطی سرزد نہیں ہوتی۔ میری مراد یہ ہے کہ عالم کائنات کی اشیاء میں کوئی غلطی اور خطا نہیں پائی جاتی؛ کیونکہ جو کچھ عالم کائنات میں ہے، وہ بالکل وہی ہے جو ہے۔۔۔ اور جب فرض یہ ہے کہ نوع انسانی کی سعادت کی طرف ہدایت اور انسانی معاشرہ میں پیدا ہونے والے اختلافات کو دور کرنے کا عامل بھی ایجاد اور تکوین ہی ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ اِس عامل کی ہدایت میں بھی خطا اور لغزش نہ پائی جائے اور نہ ہی اس کی ہدایت کے وسیلے میں جو کہ روح نبوت اور شعورِ وحی ہے، کوئی خطا اور لغزش پائی جائے۔"

خلاصہ یہ کہ اگر ہم قرآن کریم کی آیات میں تھوڑا سا غور و فکر کریں تو ہمارے اِس دعوی کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہدایت الٰہی کے فیض کے واسطوں کو معصوم ہونا چاہیے۔ سابقہ ابحاث میں واضح ہو چکا ہے کہ ہدایتِ الٰہی کے دو اہم واسطے، قرآن کریم اور نبی اکرم (ص) کی ذاتِ گرامی ہیں اور قرآن کریم نے اِن دونوں واسطوں کو ہر قسم کی آلودگی، آمیزش، خطا اور لغزش سے پاک اور "معصوم" قرار دیا ہے۔ قرآن کریم اپنے متن میں ہر قسم کے انحراف اور تحریف سے محفوظ ہے۔ اس باب میں اگر چند ناروا تہمتوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو گویا اس پر پوری امت کا اجماع اور اتفاق ہے کہ قرآن کریم خداوند تعالی کا خالص کلام ہے اور ہر دخل و تصرف سے پاک ہے۔ چنانچہ خود قرآن کریم میں ارشاد فرماتا ہے:

"وَإِنَّهُ لَكِتٰبٌ عَزِيزٌ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ" (49)

یعنی: " اور بے شک یہ ایک غالب کتاب ہے؛ باطل نہ اس کے سامنے سے آسکتا ہے نہ اس کے پیچھے سے؛ یہ حکمت والے اور ستائش کے لائق (خدا) کی طرف سے نازل کردہ ہے۔"

یہ آیۂ شریفہ ہدایتِ بشر کے الٰہی متن کے ہر قسم کی تحریف سے پاک ہونے کا ثبوت ہے۔ اس آیہ میں خدا وند تعالی نے قرآن کریم کی حفاظت کی خود ذمہ داری لے کر ہدایت کے واسطۂ فیض کی عصمت کی ضمانت فراہم فرمادی ہے۔ نیز اس مطلب پر نہ تنہا یہی آیت، بلکہ کئی دیگر آیات بھی دلالت کرتی ہیں:

"إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ" (50)

یعنی: " بے شک ہم نے ہی اس ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔"

"تَنزِيلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعَالَمِينَ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ فَمَا مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ (51)

یعنی: "یہ (کلام) عالمین کے پروردگار کی طرف سے نازل کردہ ہے؛ اور اگر اس (نبی) نے کوئی بات بھی گھڑ کر ہماری طرف منسوب کی ہوتی تو ہم اسے دائیں ہاتھ سے پکڑ لیتے؛ پھر اس کی شہ رگ کاٹ دیتے۔ پھر تم میں کوئی مجھے اس سے روکنے والا نہ ہو۔"

لہٰذا ان آیات کی روشنی میں روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہدایت الٰہی کا یہ واسطۂ فیض (قرآن کریم) ہر قسم کی آلائش، لغزش، خطا اور کمی بیشی سے پاک ہے۔ اور جہاں تک ہدایت الٰہی کے دوسرے واسطۂ فیض، یعنی نبی اکرم (ص) کی عصمت کا تعلق ہے تو وہ بھی نا قابل تردید ہے۔ حتی کہ وہ لوگ جو سہو النبی (ص) کے قائل ہوئے ہیں، ہدایتِ خلق کے عمل میں وہ بھی نبی اکرم (ص) کی عصمت کے قائل ہیں۔ بہر صورت نبی اکرم (ص) ہر قسم کی خطا و لغزش سے معصوم ہیں۔ کیونکہ آپ (ص) اپنے قول و فعل کے ذریعے قرآن کریم کی آیات کی تعلیم دینے والے ہیں۔ اور ہدایت بشر کے متن کی تفہیم و تدریس میں اگر آپ (ص) سے خطا ممکن ہو تو اس سے ہدایت کے متن (وحی) کی عصمت بے سود بن کر رہ جائے گی۔ لہٰذا نبی اکرم (ص) کا معصوم ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا قرآن کریم ہر قسم کی خطا و لغزش سے معصوم اور پاک ہے۔

پس اگر یہ مان لیا جائے کہ نبی اکرم (ص) کا قول و فعل اور آپ کی سنّت، ہدایت الٰہی کا مصداق ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ آپ (ص) معصوم ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ تین مراحل میں ہدایت الٰہی کے عہدیدار معصوم ہوں: نہ وہ "وحی" اور الٰہی پیغام کے حصول میں خطا کریں، نہ اس پیغام کو خدا کے بندوں تک پہنچانے یا تبلیغ رسالت میں خطا کریں اور نہ ہی ہدایت کے راستے میں چلتے ہوئے بشریت کیلئے عملی نمونہ

پیش کرنے میں خطا کریں۔ بنابرایں، جو شخص بھی ان تین مراحل میں کسی ایک مرحلہ پر بھی غلطی کا شکار ہو جائے وہ خدا کی طرف سے انسانیت کی ہدایت کے فیض میں واسطۂ فیض نہیں بن سکتا۔

خلاصہ یہ کہ اس بحث کے بعد ہمارے ہاتھ میں واسطۂ فیض کی پہچان کے دو اہم معیار یا خصوصیات آجاتی ہیں اور اب اگر ہم ایک ہاتھ میں ''الٰہی انتخاب'' کا معیار اور دوسرے ہاتھ میں ''عصمت'' کا معیار لے کر واسطۂ فیض کی تلاش میں نکلیں تو ہر قسم کی گمراہی سے نجات پا سکتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آیا عصر حاضر کے انسان کو کہیں ہدایت الٰہی کا کوئی ایسا واسطۂ فیض ملتا ہے جو ان معیاروں پر پورا اترتا ہو؟ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے تو فقط اہل تشیّع کا دعوی یہ ہے کہ انہوں نے ایک ایسا واسطۂ فیض پا لیا ہے جس کا نام ''امامت'' ہے اور ہدایت الٰہی کا یہ واسطہ، خدا کی بارگاہ سے منتخب بھی ہے اور معصوم بھی۔

اگرچہ ہمارا یہ مقالہ یہاں اختتام پذیر ہو جاتا ہے اور ہم ایک عقیدت مند مؤمن و مسلمان کی حیثیت سے اس باب میں اہل تشیّع ہی کے نظریہ کو اپنانے کا اعلان کرتے ہیں؛ لیکن ایک تحقیق طلب انسان کیلئے چند سوالات کا جواب پانا ابھی باقی ہے اور وہ سوالات یہ ہیں کہ آیا قرآن کریم اور اللہ کے نبی (ص) کی سنت کے بعد ''امامت'' واسطۂ فیض ہے اور اہل تشیّع کا نظریہ واقعی درست ہے؟ اگر درست ہے تو اس کی صحت کے دلائل کیا ہیں؟ اور اگر جواب منفی ہے تو پھر صحابہ و تابعین، محدّثین اور مفسرین، فقہاؑ اور ائمہ و مجتہدین کی حیثیت کیا ہے؟ کیا یہ ہدایت الٰہی کے واسطے ہیں؟ اگر ہیں تو کیا یہ بھی بارگاہ الٰہی کے منتخب اور معصوم واسطے ہیں؟ اگر نہیں تو کیا انہیں درمیان سے اٹھا لیا جا سکتا ہے؟ نیز اہل تشیع کا نظریۂ امامت اگر درست ہے تو عصر غیبت میں وہ مشابہ سوالات کا کیا جواب دیں گے؟ یقینا ان سوالات کا جواب ایک الگ مقالہ طلب کرتا ہے اور ہم یہ بحث اگلی فرصت پر چھوڑتے ہیں۔

*****

حوالہ جات

1۔ط:۵۰

2۔الشعراء:۷۸

3۔الیل: ۱۲

4۔اعلیٰ: ۳

5۔الشمس: ۸

6۔بقرہ: ۲۵۵

7۔طباطبائی محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، منشورات جامعۃالمدرسین، قم، ج ۲ ص ۳۳۰

8۔ایضا؛ج ۳ ص ۶

9۔آل عمران: ۱۸

10۔ طباطبائی محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۲ ص ص ۳۳۱

11۔ فاطر: ۱۵

12۔الفاتحہ: ۶

13۔البقرہ: ۲

14۔البقرہ: ۱۸۵

15۔ دہر/ ۳۲

16۔ابراہیم: ۱

17۔الحشر: ۷

18-جمعہ: ۲

19۔بقرہ: ۱۷۶؛آل عمران: ۳؛النحل: ۸۹؛اعراف: ۱۹۶؛الدہر: ۲۳

20۔بقرہ: ۱۱۳، ۱۷۴؛ ۲۱۳؛آل عمران: ۳؛ ۴؛ ۷، ۱۱۴؛النحل: ۶۵؛الکہف: ۱؛الشوری: ۱۷

21 ۔نساء: ۱۰۵؛انعام: ۱۵۵؛النحل: ۶۴؛العنکبوت: ۴۷؛۵۱؛الزمر: ۲،۴۱؛الحدید: ۲۵۔

22-بقرہ: ۱۲۱؛۱۴۶؛ آل عمران: ۷۹؛ نساء: ۵۴؛ انعام: ۲۰؛۸۹؛ ۱۱۴، ھود: ۱۱۰؛ الرعد: ۳۶؛ الاسراء: ۲؛ مریم: ۳۰؛ المومنون: ۴۹؛ غافر: ۵۳؛الصافات: ۱۱۷؛الفرقان: ۳۵؛القصص: ۴۳؛۵۲؛ سجدہ: ۲۳؛الجاثیہ: ۱۶

23۔السجدہ: ۲؛الزمر: ۱؛الغافر: ۲؛فصلت: ۴۵؛الزخرف: ۳؛الجاثیہ: ۲؛الاحقاف: ۲؛یوسف: ۳؛النمل: ۶؛القمر: ۱۷؛ھود: ۱

24۔آل عمران: ۷

25۔الاسراء: ۸۸

26۔الحاقہ: ۴۳تا ۴۷

27۔مائدہ: ۴۸

28۔ شوریٰ: ۱۳

29۔ شوریٰ:۲۱

30۔ جاثیہ: ۱۸

31۔ بقرہ:۱۳۲

32۔ بقرہ:۳۰

33۔ ص:۲۶

34۔ انعام:۱۲۴

35۔ قصص:۷

36۔ طہ:۱۳

37۔ مریم: ۳۰

38۔ مریم:۴۹

39۔ بقرہ:۱۲۴

40۔ الانبیاء:۷۳

41۔ سجدہ:۲۴

42۔ طہ:۲۴تا۲۹

43۔ اسراء:۸۰

44۔ آل عمران:۳۳

45۔ القصص:۶۸

46۔ یس:۴۰

47۔ الملک:۴،۳

48۔ طباطبائی، محمد حسین؛ تفسیر المیزان/ج۲، صص ۱۵۵، ۱۵۶؛ نیز اس حوالے سے سورۂ بقرہ/۲۰۵ کے ضمن میں بھی علامہؒ کی نگارشارت ملاحظہ فرمائیں!

49۔ سجدہ:۴۱،۴۲

50۔ حجر:۹

51۔ الحاقہ:۲۴

عدل الٰہی کی حقیقت

ثاقب اکبر*
ukhuwat@gmail.com

''عدل'' اور ''قسط'' جیسے الفاظ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر استعمال ہوئے ہیں۔ عدل قائم کرنا ''توازن'' برقرار رکھنے کے معنی میں آتا ہے۔ ''عدل'' قرآن حکیم میں معاوضے یا زرتلافی کے معنی میں بھی آیا ہے۔ بعض نے عدل کا ''معنی فدیہ'' لکھا ہے، عدل کا معنی اس سے بالکل برعکس بھی ہے۔ ''عدل کرنا'' پلٹ جانا، ترک کر دینا یا چھوڑ دینا کے معنی میں بھی آتا ہے۔ قرآن حکیم میں بھی عدل اور قسط کو ساتھ ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ اردو زبان میں کلمہ ''انصاف'' بھی عموماً اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے جسے انگریزی میں Justice کہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عدل کے مختلف معانی ہیں اور مختلف مصادیق ہیں۔ زیر بحث موضوع کے حوالے سے یہ سوال بنیادی ہے کہ خدا کے عادل ہونے سے کیا مراد ہے؟ اس کی وضاحت سے پہلے عدل کے مختلف معانی بیان کرنا ضروری ہیں:

ایک معنیٰ کائنات اور اشیاء کا توازن، دوسرا معنیٰ مساوات و برابری، عدل کا ایک معنی صاحب حق کو اس کا حق دینا ہے۔ اس معنی میں عدل ظلم کے بالمقابل ہے۔ البتہ ہم کہہ چکے ہیں کہ تخلیق کائنات میں توازن کا موجود ہونا ایک حقیقت ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ تناسب اور توازن خود اپنی تخلیق میں رکھا ہے، انسان کی ذات میں یہ توازن رکھا ہے اور کائنات کے اندر بھی یہ توازن موجود ہے۔ یہاں عدل کے مفہوم میں جس چیز سے اللہ تعالیٰ کی نفی کی گئی ہے اس میں کائنات اور مخلوقات میں موجود توازن کا مفہوم شامل نہیں ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ عدل الٰہی کا مفہوم اس سے وسیع تر ہے۔ اب یہ سوال کہ اللہ کے عادل ہونے سے مراد کیا ہے۔

اس سلسلے میں استاد مرتضیٰ مطہری نے بہت عمدہ کلام کیا ہے، اُن کے مطابق: '' عدل الٰہی سے مراد ہے افاضۂ وجود کے سلسلے میں استحقاقات کا خیال رکھنا اور اس موجود سے فیض و رحمت کی ممانعت اور دریغ نہ کرنا کہ جس کا وجود میں آنا یا کمال وجود تک پہنچنا ممکن ہو۔ فیض حاصل کرنے کی قابلیت کے لحاظ سے ہر موجود وہ کسی بھی مرتبے پر ہو ایک خاص استحقاق رکھتا ہے۔ ذات مقدس حق جو کمال مطلق، خیر مطلق اور فیاض علی الاطلاق ہے۔ وہ ہر موجود کو جو کچھ بھی اس کے لیے وجود اور کمال وجود کے لحاظ سے ممکن ہے عطا کرتا ہے اور اس کے عطا میں دریغ نہیں کرتا۔

*۔ صدر نشین، البصیرہ، اسلام آباد

"عدل الٰہی" کے موضوع پر بات کرنے سے پہلے دو لفظوں کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ ایک "عدل" اور دوسرا "قسط"۔ یہ دونوں الفاظ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر استعمال ہوئے ہیں۔ بعض اہل لغت نے دونوں لفظوں کو ایک دوسرے کا مترادف لکھا ہے۔

بعض نے عدل کو ظلم کی ضد قرار دیا ہے۔ (1) مقائیس اللغہ نے عدل کا معنی صحیح راستہ اور سیدھا راستہ بیان کیا ہے۔ (2) تاج العروس میں ہے کہ اونٹ کے دونوں طرف جو بوجھ لادا جاتا ہے اور جو ایک دوسرے کے برابر ہوتا ہے ان سے ہر ایک کو "عدل" کہا جاتا ہے۔ (3) اس سے مساوی اور برابر کا معنی نکلتا ہے۔ عدل قائم کرنا "توازن" برقرار رکھنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ (4)

چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

"الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ" (5)

علامہ علی نقی مرحوم نے اس کا ترجمہ یوں بیان کیا ہے:

یعنی: "جس نے تجھے خلق کیا تو تجھے سرتاپا درست بنایا، تیرے اعضا میں تناسب پیدا کی۔" (6)

اس سے مراد انسان تو متناسب الاعضاء رکھنا اور اس کے وجود میں تناسب و توازن قائم کرنا ہی ہے۔ "عدل" قرآن حکیم میں معاوضے یا زرتلافی کے معنی میں بھی آیا ہے۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں ہے:

"وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ (7)

یعنی: "اس روز سے ڈرو جب کوئی دوسرے کا بدل نہ دے سکے گا اور نہ کسی کی سفارش چلے گی اور نہ کسی سے معاوضہ لیا جائے گا اور نہ انھیں مدد پہنچائی جاسکے گی۔"

بعض نے عدل کا "معنی فدیہ" لکھا ہے، (8) یہ بھی دراصل معاوضے اور زرتلافی ہی کے مفہوم میں ہے۔ عدل کا معنی اس سے بالکل برعکس بھی ہے۔ "عدل کرنا" پلٹ جانا، ترک کر دینا یا چھوڑ دینا کے معنی میں آتا ہے۔ "عَدَلَ عن الطریق" یعنی وہ راستے سے ہٹ گیا۔ بعض اہل لغت کا کہنا ہے کہ "عن" کی وجہ سے یہ مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ (9)

مقائیس اللغہ اور صحاح اللغہ میں "قسط" کا معنی بھی عدل لکھا ہے۔ (10) قرآن حکیم میں بھی عدل اور قسط کو ساتھ ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

"فَاَصۡلِحُوۡا بَیۡنَہُمَا بِالۡعَدۡلِ وَاَقۡسِطُوۡا" (11)

یعنی: "پس ان دونوں کے درمیان عدل سے صلح کروادو اور قسط سے کام لو۔"

قسط کا معنی حصہ اور نصیب بھی کیا گیا ہے۔ (12) قسط کا معنی عدل کے برعکس اور ظلم وجور بھی کیا گیا ہے تاہم یہ مختلف معانی خود عبارت میں محل استعمال سے واضح ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن شریف میں ہے:

"وَاَنَّا مِنَّا الۡمُسۡلِمُوۡنَ وَمِنَّا الۡقٰسِطُوۡنَ" (13)

یعنی: "اور ہم میں سے کچھ فرمانبردار ہیں اور کچھ راہ حق سے بھٹکے ہوئے ہیں۔"

یہاں قاسطون راہ حق سے بھٹکے ہوئوں اور ظلم کرنے والوں کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ الفروق اللغہ میں ہے کہ جو واضح "عدل" ہو اسے "قسط" کہتے ہیں۔ اسی لیے پیمانے اور ترازو کو قسط کہتے ہیں چونکہ یہ وزن میں عدل کو واضح کر دیتا ہے۔ (14)

قسط کے معنی کو واضح طور پر سمجھنے کے لیے قرآن حکیم کی یہ آیات دیکھیے:

"شَہِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ وَالۡمَلٰٓئِکَۃُ وَاُولُوا الۡعِلۡمِ قَآئِمًۢا بِالۡقِسۡطِ" (15)

یعنی: "اللہ نے گواہی دی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور فرشتوں اور اہل علم نے بھی یہی شہادت دی ہے۔ وہی عدل قائم کرنے والا ہے۔"

"لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَاَنۡزَلۡنَا مَعَہُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡمِیۡزَانَ لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ" (16)

یعنی: "بتحقیق ہم نے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ہمراہ کتاب اور میزان (عدل) کو (بھی) بھیجا تاکہ لوگ قسط (انصاف وعدالت) سے کام لیں۔"

"قُلۡ اَمَرَ رَبِّیۡ بِالۡقِسۡطِ" (17)

یعنی: "کہہ دو کہ میرے پروردگار نے عدل کا حکم دیا ہے۔"

اردو زبان میں کلمہ "انصاف" بھی عموماً اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے جسے انگریزی میں Justice کہتے ہیں۔ "انصاف" "نصف" سے ہے۔ عربی زبان میں یہ لفظ عدل و قسط کا مترادف نہیں ہے۔ آدھا آدھا

کرنے کو نصف کہتے ہیں۔ کبھی نصف نصف کرنا خارج میں عدل ہی کا تقاضا ہوتا ہے جیسے دو بھائیوں کے درمیان ماں یا باپ کی وراثت کو نصف نصف تقسیم کیا جانا ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہمیشہ نصف نصف کرنا عدل کا بھی تقاضا ہو۔

چور کی انگلیاں کاٹنا ایک مفہوم میں عدل ہو سکتا ہے لیکن انصاف نہیں۔ "نصف النھار" آدھے دن اور "نصف الطریق" آدھے راستے کو کہتے ہیں۔ قرآن حکیم میں "نصف" آدھے کے معنی میں ہے جیسے بیٹی کے لیے بیٹے کی نسبت آدھا حصہ بیان کرنے کے لیے کہا گیا ہے: "فَلَهَا النِّصْفُ" (18) لہٰذا پیش نظر مقالے میں ہمارا سروکار دو لفظوں سے ہے "عدل" اور "قسط" ۔تاہم عدل الٰہی کی کلامی بحث میں کلمہ "عدل" بروئے کار لایا جائے گا۔ اگرچہ ہم لکھ چکے ہیں کہ "عدل" قرآن حکیم میں "توازن" کے معنی میں بھی آیا ہے تاہم قرآن مجید میں خود لفظ میزان، وزن وغیرہ بھی اسی مفہوم میں آئے ہیں۔ مثلاً

"وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ۔" (19)

یعنی: " اور آسمان کو اس نے بلند کیا اور توازن قائم رکھنے کا اصول مقرر کیا۔"

"وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ"

یعنی: " اور ہم نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ ڈالے اور اس میں سے ہر طرح کی موزوں چیزیں اُگائیں۔" (20)

عدل کے مختلف معانی پر ایک نظر

مندرجہ بالا سطور سے ظاہر ہوتا ہے کہ عدل کے مختلف معانی ہیں اور مختلف مصادیق ہیں۔ زیر بحث موضوع کے حوالے سے یہ سوال بنیادی ہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ خدا عادل ہے تو اس سے کیا مراد ہے۔ "عدل" کے مختلف مصادیق کا جائزہ لیتے ہوئے ہم آگے بڑھیں گے۔ مقدماتی مسائل سے گزرے بغیر ہم "عدل الٰہی کے مفہوم کو واضح نہیں کر سکتے۔

کائنات اور اشیاء کا توازن

اس میں کوئی شک نہیں کہ پوری کائنات میں توازن و تناسب کا ایک نظام موجود ہے۔ ہر شے کی بقا کے لیے بھی اس میں موجود ایک طرح کے توازن کا قائم رہنا ضروری ہے۔ زمین کا سورج سے فاصلہ، زمین کا حجم، زمین

کا قطر، زمین میں حیات، زمین کے موسم، مختلف اشیاء کا درجہ حرارت اور حسب ضرورت چیزوں میں نشوونما یہ سب کچھ ایک نظام متوازن کے سہارے قائم ہے۔ سورج اور زمین کے مابین فاصلہ بڑھ جانے کی صورت میں اس کا درجہ حرارت کم ہو جائے گا اور ہر چیز منجمد ہو کر رہ جائے گی اور حیات کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اسی طرح فاصلہ کم ہو جانے کی صورت میں ہر چیز شعلہ ور ہو جائے گی اور جل کر راکھ ہو جائے گی۔ یہی حال اس کے حجم کا ہے اس میں کمی بیشی کا تصور آتے ہی یہ بات کھل جاتی ہے کہ اس نظام کی بقا کے لیے اسی حجم کا باقی رہنا ضروری ہے۔

تاہم کائنات اور اس کی موجودات میں توازن کا ہونا ایسا موضوع ہے جس کا کوئی انکار نہیں کرتا۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کو نہیں مانتے وہ بھی اس کا انکار نہیں کر سکتے۔ لہٰذا زیر بحث موضوع "عدل الٰہی" اس معنی میں نہیں ہے۔ معاشرے میں توازن کا قائم رکھنا بھی ضروری ہے۔ معاشرے میں اختیارات کی تقسیم میں توازن، دولت اور وسائل کی تقسیم میں توازن، عمارتوں کی ساخت اور بلندی و پستی میں توازن سب کچھ مطلوب ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ معاشرے میں عدل قائم کرنے سے مراد ہر طرح کا توازن قائم کرنا ہے تو یہ غلط نہ ہوگا۔ توازن ہی حسن کا مظہر ہے اور عدم توازن قبح کو وجود بخشتا ہے۔

مساوات و برابری

جیسا کہ ہم نے لغت کی بحث میں دیکھا ہے عدل کا ایک معنی مساوات بھی ہے۔ البتہ مساوات ایک مقام پر درست اور پسندیدہ ہے تو دوسرے مقام پر ناپسندیدہ اور غلط ہے۔ مثلاً کسی ملک میں ایک قانون حکمرانوں اور عوام کے لیے مساوی ہو تو یہ عین عدل ہے۔ معاشرتی حوالے سے کہا جاتا ہے کہ قانون کا مساوی ہونا اور اس کے نفاذ میں مساوات کو ملحوظ رکھنا عدل ہے۔

اسی طرح استاد اپنے طالب علموں کو ایک طرح سے درس دیتا ہے، سب کی تعلیم و تربیت کا مساوی خیال رکھتا ہے تو یہ عدل ہے لیکن اگر امتحانات میں سب کو مساوی نمبر دیتا ہے تو یہ عدل نہیں ہے کیونکہ کسی نے اچھا اور صحیح جواب دیا ہے، کسی نے غلط اور کسی نے جواب ہی نہیں دیا۔ اس مرحلے میں عدل یہ ہے کہ سب کو مساوی نمبر نہ دیے جائیں بلکہ جو کسی کا حق ہے اس کے مطابق نمبر دیے جائیں۔ عدل الٰہی مساوی سلوک

کرنے کے معنی میں نہیں ہے۔ کبھی مساوات توازن کو پیدا کرتی ہے اور کبھی عدل توازن کو اور اسی طرح کبھی مساوات عدل کے معنی پر پوری اترتی ہے اور کبھی ظلم کو جنم دیتی ہے۔

صاحب حق کو حق دینا

عدل کا ایک معنی صاحب حق کو اس کا حق دینا ہے۔ اس معنی میں عدل ظلم کے بالمقابل ہے۔ مندرجہ بالا مثال میں استاد کا سب طلبہ کو ایک جیسے نمبر دینا ظلم ہے۔ اس مفہوم میں عدل ہر صاحب حق کو اس کا حق دینے سے عبارت ہے اور ظلم خلاف حق کسی سے برتاؤ یا اسے کچھ دینے کے معنی میں ہے۔ ظلم حق سے تجاوز سے عبارت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ٹوپی کا حق ہے کہ اسے سر پر رکھا جائے اور جوتے کا حق ہے کہ اسے پاؤں میں پہنا جائے۔ اگر اس کے برعکس کیا جائے یعنی ٹوپی پاؤں میں رکھی جائے اور جوتے کو سر پر تو یہ سراسر ظلم ہے۔

انسانی معاشرے میں بھی عدل اسی معنی میں پسندیدہ ہے۔ عدل اجتماعی کا بنیادی تصور اس مفہوم کو لیے ہوئے ہے۔ اسی لیے کمیونزم کے تصورِ مساوات پر مسلمان مفکرین تنقید کرتے ہیں اور وہ اس کے مقابلے میں عدل کا تصور پیش کرتے ہیں۔ قرآن حکیم میں جو عدل و قسط کو معاشرے میں قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ اسی مفہوم میں ہے۔ عدل قائم کرنے کے حوالے سے فرمایا گیا ہے: "اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى" یعنی: " عدل اختیار کرو کہ یہ تقویٰ کے نزدیک ترین ہے۔" (21) "وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى" یعنی: " اور جب تم بات کرو تو عدل کے مطابق کرو اگرچہ (جس کے بارے میں بات ہو) وہ تمھارا عزیز ہی کیوں نہ ہو۔" (22)

گویا حق و حقیقت کے مطابق بات کرنا بھی عدل ہے۔ گاہے حق اولویت بھی اسی مفہوم میں پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً بزرگوں کے احترام کے حکم میں ماں باپ حق اولویت رکھتے ہیں۔ تعلیم و تربیت میں اولاد اور اپنے گھر والے حق اولویت رکھتے ہیں۔ اسی لیے قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے: "قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا" یعنی: " اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ۔" (23)

حضرت ابراہیم مغفرت کی دعا کرتے ہوئے پہلے اپنے لیے، پھر والدین کے لیے اور پھر مومنین کے لیے طلب مغفرت کرتے ہیں۔ " رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ" یعنی: " اے ہمارے پروردگار! مجھے، میرے والدین کو اور مومنین کو بخش دے جس روز حساب قائم ہو۔" (24)

ہم جانتے ہیں کہ انبیاء اپنے سارے مخاطبین کے لیے بالخصوص اور ساری انسانیت کے لیے بالعموم آتش جہنم سے نجات کا پیغام لے کر آتے ہیں۔ اسی طرح سے اہل ایمان پر بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ عائد کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود اس میں شک نہیں کہ سب سے پہلے انسان کی اپنی ذات اس پیغام کو قبول کرنے کا استحقاق رکھتی ہے اور پھر جو جتنا قریب ہے اس تک یہ پیغام پہنچانا چاہیے۔ اسی طرح حضرت ابراہیمؑ اگرچہ تیسرے مرحلے میں مومنین کے لیے عمومی دعائے مغفرت کرتے ہیں لیکن پہلے مرحلے میں اپنے لیے اور دوسرے مرحلے میں والدین کے لیے طلب مغفرت کرتے ہیں۔ ان آیات سے اولویت کا مفہوم اخذ کیا جاسکتا ہے۔

عدل اجتماعی کے حوالے سے ہم جانتے ہیں کہ بنیادی طور پر اس کے مطابق انسانوں سے تقاضا کیا جاتا ہے کہ انھیں یہ کام کرنا چاہیے اور یہ کام نہیں کرنا چاہیے، قانون ایسا ہونا چاہیے اور ایسا نہیں ہونا چاہیے، قانون پر یوں عمل ہونا چاہیے اور یوں عمل نہیں ہونا چاہیے یا معاشرے کی یہ ضرورت ہے اور یہ ضرورت نہیں ہے۔ ایسا کرنا معاشرے کے لیے اچھا ہے اور ایسا کرنا اچھا نہیں ہے۔ ظاہر ہے یہ ساری باتیں حق تعالیٰ کے لیے درست نہیں ہیں۔ عدل کے ان معانی پر پروردگار کے حوالے سے تبصرہ کرتے ہوئے استاد مطہریؒ نے اپنی کتاب عدل الٰہی میں جو کچھ بیان کیا ہے اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

"جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ عدل کے مذکورہ بالا معنی ایک طرف تو اولویت و فوقیت کی بنیاد پر استوار ہیں تو دوسری طرف انسان کی ذاتی خصوصیات اس کی اساس قرار پاتی ہیں، جس کے مطابق انسان چند "اعتباری و قرار دادی مفاہیم" کو استعمال کرنے پر مجبور ہے۔ نیز "ہونا چاہیے" اور "نہیں ہونا چاہیے" جیسے مفاہیم بھی اسے بنانے پڑتے ہیں اور اسی مقام پر انسان حسن و قبح جیسے مفاہیم کو اخذ و انتزاع کرتا ہے۔ مندرجہ بالا تمام نکات اور فکری مراحل ذہن انسانی سے مخصوص ہیں، ذات حق تعالیٰ میں ان کا کوئی وجود نہیں، کیونکہ وہ مالک علی الاطلاق ہے، کوئی بھی شے اس کے مقابلے میں کسی بھی شے پر کسی بھی قسم کی فوقیت یا اولویت نہیں رکھتی۔

جس طرح سے وہ مالک علی الاطلاق ہے اسی طرح سے اولیٰ علی الاطلاق بھی ہے۔ اس کا ہر چیز میں ہر طرح کا دخل و تصرف، اس چیز میں دخل و تصرف ہے جس کی تمام تر ہستی کا دارومدار اسی پر ہے اور بلا شرکت غیرے اس کی ملکیت میں ہے۔ بنابرایں، اس معنی میں ظلم یعنی دوسروں کی اولویت و فوقیت کو پامال کرنا، ان کے حق میں تصرف کرنا اور ان کے دائرہ اختیار میں قدم رکھنا کہلائے گا۔ لہٰذا ظلم کے مذکورہ بالا مفاہیم

کا تصور، خدا کے بارے میں یکسر ناممکن ہے کیونکہ یہ مفاہیم خدا کے افعال پر صادق آہی نہیں سکتے اور ذات پروردگار کا کوئی بھی فعل اس طرح کے ظلم کا مصداق واقع ہو ہی نہیں سکتا۔"

البتہ ہم کہہ چکے ہیں کہ تخلیق کائنات میں توازن کا موجود ہونا ایک حقیقت ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ تناسب اور توازن خود اپنی تخلیق میں رکھا ہے، انسان کی ذات میں یہ توازن رکھا ہے اور کائنات کے اندر بھی یہ توازن موجود ہے۔ جیسا کہ توازن کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے مندرجہ بالا سطور میں چند ایک آیات بھی پیش کی گئی ہیں۔ یہاں عدل کے مفہوم میں جس چیز سے اللہ تعالیٰ کی نفی کی گئی ہے اس میں کائنات اور مخلوقات میں موجود توازن کا مفہوم شامل نہیں ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ عدل الٰہی کا مفہوم اس سے وسیع تر ہے۔ اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ پھر جب ہم کہتے ہیں کہ اللہ عادل ہے تو اس سے ہماری مراد کیا ہے۔ اس سلسلے میں استاد مرتضیٰ مطہری نے بہت عمدہ کلام کیا ہے ہم ان کی چند سطور پیش کرتے ہیں:

" رعایت استحقاقها درافاضهٔ وجود وامتناع نکردن از افاضه ورحمت به آنچه امکان وجود یا کمال وجود دارد--- هر موجودی در هرمرتبه ای هست از نظر قابلیت استفاضه، استحقاقی خاص به خود دارد- ذات مقدس حق که کمال مطلق و خبر مطلق و فیاض علی الاطلاق است- به هر موجودی آنچه را که برای او ممکن است از وجود و کمال وجود، اعطامی کند و امساك نمی نماید- عدل الهی در نظام تکوین، طبق این نظریه، یعنی هرموجودی، هر درجه از وجود و کمال وجود که استحقاق و امکان آن را دارد دریافت می کند- ظلم یعنی منع فیض وامساك جود از وجودی که استحقاق دارد۔

از نظر حکمای الهی، صفت عدل آنچنانکه لایق ذات پروردگار است و بعنوان یک صفت کمال برای ذات احدیت اثبات می شود به این معنی است، وصفت ظلم که نقص است و از اوسلب می گردد نیز به همین معنی است که اشاره شد۔" ([25])

یعنی: " عدل الٰہی سے مراد ہے افاضۂ وجود کے سلسلے میں استحقاقات کا خیال رکھنا اور اس موجود سے فیض و رحمت کی ممانعت اور دریغ نہ کرنا کہ جس کا وجود میں آنا یا کمال وجود تک پہنچنا ممکن ہو۔ فیض حاصل کرنے کی قابلیت کے لحاظ سے ہر موجود وہ کسی بھی مرتبے پر ہو
ایک خاص استحقاق رکھتا ہے۔ ذات مقدس حق جو کمال مطلق، خیر مطلق اور فیاض علی الاطلاق ہے۔ وہ ہر موجود کو جو کچھ بھی اس کے لیے وجود اور کمال وجود کے لحاظ سے ممکن ہے عطا کرتا ہے اور اس کے عطا میں دریغ نہیں کرتا۔
عدل الٰہی کے اس نظریے کے مطابق نظام تکوین میں ہر موجود وہ جس درجے پر بھی ہو وجود اور کمال وجود کے لحاظ سے جو بھی استحقاق اور امکان رکھتا ہو اسے پالیتا ہے۔ لہٰذا ظلم یعنی کسی وجود سے اس کے مستحقہ فیض کو روک لینا اور جود و بخشش کے بجائے، عطا کرنے میں بخل سے کام لینا۔ حکمائے الٰہی کی نظر میں پروردگار عالم کے شایان شان صفت عدل جو ذات یکتا کے لیے بطور صفت کمال ثابت ہے، اسی معنی میں ہے اور ظلم جو کہ ایک نقص ہے اور صفات سلبیہ میں سے ہے مذکورہ بالا معنی میں ہے۔"

*****

حوالہ جات

1۔ صحاح اللغۃ، ع د ل کے مادہ میں
2۔ ابن فارس: مقائیس اللغۃ، ع د ل کے مادہ میں
3۔ محب الدین ابن الفیض: تاج العروس، ع د ل کے مادہ میں
4۔ محب الدین ابن الفیض: تاج العروس، ع د ل کے مادہ میں
5۔ انفطار: ۷
6۔ قرآن کریم: ترجمہ علامہ سید علی نقی نقوی (ہنگو جامعۃ القائم للبنات، ۲۰۰۸ء) ص، ۸۲۷
7۔ بقرہ: ۴۸
8۔ ابن فارس: مقائیس اللغۃ، ع د ل کے مادہ میں

9۔ محیط، ع د ل کے مادہ میں

10۔ ع د ل کے مادہ میں

11۔ حجرات: ۹

12۔ مقائیس اللغہ، صحاح اللغہ اور تاج العروس، ق س ط کے مادہ میں

13۔ جن: ۱۴

14۔ الفروق اللغہ

15۔ آل عمران: ۱۸

16۔ الحدید: ۲۵

17۔ اعراف: ۲۹

18۔ نساء: ۱۱

19۔ رحمٰن: ۷

20۔ حجر: ۱۹

21۔ مائدہ: ۷

22۔ انعام: ۱۵۲

23۔ تحریم: ۶

24۔ ابراہیم: ۴۱

25۔ مطہری، مرتضیٰ: عدل الٰہی (تہران انتشارات صدرا) ص ۵۷ و ۵۸

مذہب اہل بیت علیہم السلام میں تکفیر کی شرعی حیثیت

سید رمیز الحسن موسوی*
srhm2000@yahoo.com

مسئلہ تکفیر ایک عرصے سے اسلامی مسالک وفِرق کے درمیان نزاع کا باعث بنا ہوا ہے۔ ہر دور میں سامراج سے وابستہ بعض گروہوں نے مسلمانوں کی ایک جماعت کو دائرہ اسلام سے خارج کرنے کی سعی کی ہے۔ گو یہ سلسلہ اب فقط امامیہ مسلک تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ سامراج کی سیاسی ضرورت کے تحت اہل تسنن کے مختلف گروہ بھی تکفیر کے ہتھیار کا نشانہ بننے لگے ہیں۔ تکفیر کی تعریف سے ظاہر ہوتا ہے کہ تکفیر، ایمان کے بعد کفر کو کہتے ہیں۔

کسی مسلمان کی تکفیر کا مسئلہ ایک حساس مسئلہ ہے اور بغیر کسی شرعی دلیل کے کسی کی تکفیر نہیں کی جاسکتی۔ خدا کے انکار، حضرت محمد (ص) کی رسالت کے انکار، قیامت کے انکار اور ضروریات اسلام میں سے کسی ایک کے انکار کے سبب کسی بھی مسلمان کی تکفیر کی جاسکتی ہے۔ لیکن اسی وقت کسی مسلمان کی تکفیر کی جاسکتی ہے کہ جب وہ اپنے قول وفعل کے ذریعے مذکورہ مسلمہ عقائد کی نفی کرکے اپنی تکفیر کے اسباب فراہم کردے۔ کسی مسلمان کی تکفیر پر بہت سے فقہی اور معاشرتی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ کسی کی تکفیر، درحقیقت اس کی موت کا حکم صادر کرنے کے برابر ہے۔ اس لئے ہر شخص کو کسی دوسرے مسلمان کی تکفیر کا حق حاصل نہیں ہے؛ بلکہ فقط عادل اور اسلامی احکام سے آگاہ فقہاء ہی کسی مسلمان کے کردار وگفتار کے بارے میں فیصلہ دینے کا حق رکھتے ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق (ع) فرماتے ہیں: توحید اور رسالت کی گواہی دینے کا نام اسلام ہے۔ اسلام لانے سے خون محفوظ ہو جاتا ہے، نکاح درست قرار پاتا ہے اور میراث مل جاتی ہے۔ ایک اور مقام پر امامؑ فرماتے ہیں: ''ملعون ہے، ملعون ہے وہ شخص جو کسی مسلمان پر کفر کی تہمت لگائے، مسلمان کی تکفیر، اُسے قتل کرنے کے برابر ہے۔'' انہی فرامین کی بنا پر شیخ صدوق کتاب '' ھدایہ ''میں لکھتے ہیں :اسلام، شھادتین کی گواہی دینے کا نام ہے اور اس کے ذریعے جان ومال محفوظ ہو جاتے ہیں اور جو بھی لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ کہے اُس کی جان ومال محفوظ ہے۔ فقہائے امامیہ کے نزدیک تازہ مسلمان اور منکر وصایت وجانشینی حضرت علی (ع) کی تکفیر جائز نہیں ہے۔ لیکن خوارج، نواصب، بت پرستوں، مُجسّمہ ومشبّھہ، مجبّرہ، مفوّضہ، اللہ تعالیٰ کو دشنام دینے والوں، انبیائے کرام، پیغمبر اکرم، ائمہ طاہرین اور حضرت فاطمہ الزہراء (س) کو دشنام دینے والوں نیز ملائکہ کو دشنام دینے والوں، غالیوں اور اسلام کی توہین کرنے والوں کی تکفیر جائز ہے۔

*۔مدیر مجلّہ سہ ماہی "نور معرفت" نور الہدیٰ مرکز تحقیقات (نمت) بھارہ کہو، اسلام آباد

تمہید

گذشتہ شمارے میں ہم نے مذہب اہل بیت علیہم السلام کی روشنی میں کفر وکافر کے مفہوم کی وضاحت پیش کرتے ہوئے اس مسئلے کے بارے میں ائمہ اطہار علیہم السلام کی روایات کی روشنی میں بحث کی تھی۔ اس شمارے میں اسی موضوع سے متعلق ایک اور معرکۃ الآراء مسئلے کی شرعی حقیقت بیان کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ وہ ہے مسئلہ تکفیر جو ایک عرصے سے اسلامی مسالک وفِرَق کے درمیان نزاع کا باعث بنا ہوا ہے، یہاں تک کہ ایک گروہ دوسرے مسلمانوں کی تکفیر کی وجہ سے ''تکفیری'' گروہ کہلانے لگا ہے۔ اس سلسلے میں جو چیز انتہائی اہم ہے وہ یہ کہ تکفیر ی گروہ نے یہ ہتھیار سب سے زیادہ امامیہ مسلک کے خلاف استعمال کیا ہے اور ہر دور میں تکفیر کے ہتھیار سے مسلمانوں کی ایک جماعت کو دائرہ اسلام سے خارج کرنے کی سعی کی ہے۔ گو کہ یہ سلسلہ اب فقط امامیہ مسلک تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ سامراج کی سیاسی ضرورت کے تحت اہل تسنن کے مختلف گروہ بھی اس تیر کا نشانہ بننے لگے ہیں۔

اس تحریر میں قرآن و سنت اور شریعت اسلامیہ میں مسئلہ تکفیر کی حقیقت کو سمجھنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مذہب امامیہ میں شرعی طور پر تکفیر کے مختلف اسباب اور پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ مذہب اہل بیت علیہم السلام میں کس شخص کی تکفیر جائز ہے اور کس کی تکفیر جائز نہیں۔

تکفیر کا لغوی معنیٰ

جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے کہ کلمہ تکفیر مادۂ ''کفر'' سے ہے اور کسی کو کافر کہنے، چھپا لینے، معاف کرنے اور کفارہ دینے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ (1) البتہ دوسرے معانی کے علاوہ کسی سے کفر کی نسبت دینا اور اُسے کافر قرار دینا اس کے مشہور معانی میں سے ہے۔ اس نسبت کی وجہ سے کفر سے متصف شخص دائرہ اسلام سے خارج سمجھا جاتا ہے اور اس پر احکام اسلام لاگو نہیں ہوتے۔ یعنی اُس کے ساتھ مسلمانوں والے تعلقات برقرار نہیں کئے جا سکتے۔

ماہیت تکفیر

گذشتہ مقالہ میں کفر کا لغوی واصطلاحی معنیٰ اور کفر کی حقیقت کو شرعی حوالے سے ذکر کیا گیا ہے اور کافر کی ماہیت اور مراتب بھی ذکر ہو چکے ہیں۔ اس سے کسی حد تک کلمہ تکفیر بھی لغوی و اصطلاحی لحاظ سے واضح ہو گیا ہے۔ جس کے مطابق کسی سے کفر کی نسبت دینے کو تکفیر کہا جاتا ہے۔ تکفیر کا یہ معنیٰ مشہور ہے اور اکثر کتب لغت میں اس کے دوسرے معانی کے ساتھ ساتھ کسی کو کافر کہنا بھی تکفیر کہلاتا ہے۔

تکفیر کی اس تعریف سے ظاہر ہوتا ہے کہ تکفیر، ایمان کے بعد کفر کو کہتے ہیں یا جو لوگ پہلے اسلام قبول کر لیتے ہیں یا پیدائشی مسلمان ہوتے ہیں، لیکن بعد میں اسلام کے کسی اصول یا ضروریات میں سے کسی ایک کا انکار کرکے دوبارہ کفر کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ اور دینی اصطلاح میں مرتد ہو جاتے ہیں اُن کو کافر کہا جاتا ہے یا اُن کی تکفیر کی جاتی ہے۔ البتہ شرعاً تکفیر شدہ شخص کا ارتداد واضح ہونا چاہیے تاکہ اس پر اس پر ارتداد کے احکام مرتب ہو سکیں۔ اگر اس کا ارتداد ثابت نہیں ہوتا اور اس بارے میں شک و شبہ ہوتا ہے تو اس کو اسلام کے دائرے سے خارج قرار نہیں دیا جا سکتا اور اس کے ساتھ کفر کی نسبت دینا گناہان کبیرہ میں سے شمار ہوتا ہے لہٰذا کسی مسلمان کی تکفیر کا مسئلہ ایک حساس مسئلہ ہے، جسے بغیر کسی شرعی دلیل اور ثبوت کے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

کفر کی اقسام

کفر تین طرح سے ہو سکتا ہے:

الف: ارتداد

یعنی، کوئی مسلمان دین اسلام کو چھوڑ کر یہودی، عیسائی، مجوسی یا صابئی مذاہب میں سے کسی ایک کا پیروکار بن جائے، اس قسم کے کفر کو ارتداد کہتے ہیں جس کے خاص احکام ہیں۔

ب: شرک

یعنی، کوئی مسلمان پروردگار عالم کی وحدانیت اور یکتائی کے عقیدے سے ہاتھ اٹھا کر متعدد خداؤں کا معتقد ہو جائے۔ اس قسم کے کفر کو شرک کہتے ہیں، اس پر بھی خاص احکام لاگو ہوتے ہیں۔

ج: ضروریات دین کا انکار

یعنی، دین کے بعض ضروری عقائد میں سے کسی ایک کا انکار کرنا۔

اسباب تکفیر

فقہائے امامیہ، آیات وروایات اور مذہب کے کلی اصولوں کی روشنی میں چند چیزوں کو اسلام و کفر کی حد قرار دیتے ہیں، یعنی اگر کوئی مسلمان واقعاً یا ظاہراً ان چیزوں میں سے کسی ایک کا یا تمام چیزوں کا انکار کرے تو وہ مسلمان باقی نہیں رہتا اور اس کی تکفیر کی جا سکتی ہے۔ وہ چیزیں یہ ہیں:

ا۔ وجود خدا کا انکار

ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود پر ایمان رکھتا ہو اور اُسے اپنا اور پوری کائنات اور اس میں موجود مخلوقات کا پروردگار جانتا ہو۔ بنابریں اللہ تعالیٰ کے پروردگار ہونے کے بارے میں ہر قسم کا شک و شبہ یا انکار، تکفیر کا سبب بن جاتا ہے۔

۲۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا انکار

ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ دوسرے انبیائے کرام (ع) کے علاوہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت ورسالت پر ایمان رکھتا ہو۔ پس آپؐ کی نبوت ورسالت کا انکار یا آپؐ کے جھوٹے ہونے کا اعتقاد یا آپؐ کی جانب سے لائی ہوئی شریعت کے جھوٹے ہونے کا اظہار یا بطور کلی آپؐ کے بارے میں ہر قسم کے منفی عقیدے کا اظہار انسان کی تکفیر کا سبب بن جاتا ہے۔

۳۔ قیامت کا انکار

اسلام کے دائرے میں داخل ہونے کے لئے روز آخرت یعنی؛ قیامت پر اعتقاد رکھنا بھی ضروری ہے۔ بہت سی آیات قرآن ہیں قیامت پر اعتقاد کو اللہ تعالیٰ کی توحید و وحدانیت کے اعتقاد کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً :

"۔۔۔وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔۔۔" (2)

"۔۔۔۔۔اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔۔۔" (3)

"۔۔۔اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔۔۔" (4)

لہٰذا فقہاء قیامت پر عقیدے کو بھی مسلمانوں کے کلی عقائد کا ایک حصہ قرار دیتے ہیں اور اس کے انکار کو تکفیر کا سبب سمجھتے ہیں۔

۴۔ ضروریات اسلام میں سے کسی ایک کا انکار

جو چیزیں تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہیں اور وہ انہیں اسلام میں شمار کرتے ہیں، ان کا انکار نہیں کرنا چاہئے، جیسے نماز، روزہ اور حج کا وجوب یا شراب نوشی، سود کھانے، محرموں سے شادی بیاہ کرنے وغیرہ کی حرمت یا اس جیسی اور چیزیں کہ جن کے حکم سے تمام مسلمان واقف ہیں، انہیں ضروریات دین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ضروریات دین خواہ عقائد ہوں یا احکام یا گزشتہ انبیاء (ع) کی نبوتیں کہ جن کا ذکر قرآن کریم میں ہوا ہے، ان پر اعتقاد رکھنا ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے۔

جو شخص کسی بھی ضرورت دین کا انکار کرے اس کی تکفیر جائز ہے۔ چونکہ یہ مسئلہ بھی مسلمانوں کی تکفیر کے اہم ترین اسباب میں سے شمار ہوتا ہے۔ کیونکہ کم ہی کوئی ایسا شخص ملے گا جو پروردگار عالم کے وجود اور نبی اکرم (ص) کی نبوت کا انکار کرتا ہو، لیکن ہو سکتا ہے کوئی شخص نماز، روزہ، حج وغیرہ جیسی ضروریات اسلام کے انکار کرنے اپنی تکفیر کے اسباب فراہم کر دے۔

کیا فقط ضروریات دین میں سے کسی ایک ضرورت دین کا انکار کرنا کسی مسلمان کی تکفیر کا سبب بن جاتا ہے؟ اس بارے میں فقہاء میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بعض فقہاء فقط کسی بھی ضروری دین کے انکار کو کفر کا باعث جانتے ہیں، لیکن بعض مشہور فقہاء کے نزدیک تنہا کسی

ضرورت دین کا انکار تکفیر کا سبب نہیں بنتا بلکہ اگر اُس ضرورت دین کے انکار کی بازگشت رسول خدا (ص) کی نبوت کے انکار کی طرف ہوتی ہو یا آپؐ کے احکام میں شک و شبہ کا باعث بنتا ہو تو وہ باعث تکفیر ہے۔ جیسا کہ امام خمینیؒ، کافر کے نجس ہونے کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''الکافر، وھو من انتحل غیر اسلام، أوانتحله وجحدمایعلم من الدین ضرورة، بحیث یرجع جحودہ الی انکار الرسالة۔ اوتکذیب النبی صلی اللہ علیه وآله وسلم، او تنقیض شریعة المطهرة، اوصدر منه ما یقتضی کفرہ من قول اوفعل۔'' (5)

یعنی: ''کافر سے مراد ایسا شخص ہے جو غیر اسلام کی طرف رغبت رکھتا ہو یا یہ کہ اسلام کی طرف رغبت رکھتا ہے، لیکن یہ جاننے کے باوجود کہ فلاں چیز ضروریات دین میں سے ہے، پھر بھی اس کا اس طرح انکار کرے کہ جس کی بازگشت رسالت کے انکار یا پیغمبر اکرمؐ کے جھوٹا ہونے یا شریعت مطہرہ کے ناقص ہونے کی طرف ہوتی ہو یا اس سے ایسا کلام صادر ہو جو اس کے کفر کا موجب بنے''۔

اسی طرح آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

''لوکان انکارہ لشئی من ضروریات الدین راجعاً الیٰ انکار الرسالة، اوتکذیب نبی الاسلام صلی اللہ علیه وآله، او الیٰ تنقیص الشریعة فهو کفر وارتداد۔'' (6)

یعنی: ''اگر ضروریات دین میں سے کسی چیز کے انکار کی بازگشت، نبوت کے انکار یا پیغمبر اسلام (ص) کی تکذیب یا شریعت کی تنقیص کی طرف ہوتی ہو تو یہ کفر وارتداد ہے۔''

تکفیر کے ثابت ہونے کا طریقہ

اسلام میں بنیادی اصول دوسرے مسلمانوں کے قول و فعل اور اعتقاد کے بارے میں حسن ظن رکھنا ہے، لہٰذا کوئی بھی مسلمان فقط شک و شبہ یا دوسروں کی کسی بات کی تأویل کی بنا پر یا ان کی رائے کے ساتھ موافق نہ ہونے یا استدلال میں اختلاف وغیرہ کی بنا پر کسی کی تکفیر کا حق نہیں رکھتا، بلکہ مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ کسی بھی مسئلے میں اختلاف کی صورت میں اسلامی آداب و قواعد کے مطابق بحث و گفتگو کریں اور ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنا مدعا بیان کرنے میں کسی قسم کا خوف وخطر محسوس نہ کریں۔

یہ طریقہ کار اس وقت تک اپنایا جا سکتا ہے کہ جب تک اسلام کے کلی اصول و ضوابط کی پاسداری کی جائے۔ فقط اسی وقت کسی مسلمان کی تکفیر کی جا سکتی ہے کہ جب وہ مسلمہ عقائد کی نفی کر کے اپنی تکفیر کے اسباب فراہم کر دے۔ وہ اس نفی و انکار کا اظہار دو طریقوں سے کر سکتا ہے:

۱۔ اپنے قول و کلام کے ذریعے

یعنی کوئی مسلمان واضح طور پر اپنی زبان سے توحید، رسالت، قیامت اور ضروریات دین میں سے کسی ایک کا انکار کر کے اپنی تکفیر کے اسباب فراہم کرے۔

۲۔ اپنے کسی فعل کے ذریعے وہ مذکورہ چار عقائد میں سے کسی ایک کا انکار کرے

اس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ انکار کرنے والا شخص عاقل، بالغ اور پوری ذمہ داری اور مکمل آگاہی کے ساتھ مذکورہ عقائد میں سے کسی ایک کا انکار کرے خواہ اس کا یہ انکار دین کے ساتھ استہزاء کے طور پر ہو یا عناد و ہٹ دھرمی کی بناء پر ہو۔ جیسا کہ صاحب جواہر لکھتے ہیں: ''مسلمان کا اللہ تعالیٰ، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، مقام رسالت سے استہزاء کرنا ارتداد کا موجب بنتا ہے۔'' (7)

تکفیر کا حق کس کو حاصل ہے؟

کسی مسلمان کی تکفیر پر بہت سے فقہی و معاشرتی اثرات مرتب ہوتے ہیں، چونکہ کسی کی تکفیر کرنا، درحقیقت اس کی موت کا حکم صادر کرنے کے برابر ہے۔ اس لئے ہر شخص کو کسی دوسرے مسلمان کی تکفیر کا حق حاصل نہیں ہے۔ بلکہ فقط عادل اور اسلامی احکام سے آگاہ فقہاء ہی دوسرے مسلمانوں کے کردار و گفتار کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ جس شخص یا گروہ کی تکفیر کی جا رہی ہے، اس کے بارے میں شرعی دلیل قائم کی جائے کہ یہ شخص یا گروہ دائرہ اسلام سے خارج ہے اور فقہی لحاظ سے اس سے وہ تعلقات برقرار نہیں رکھے جا سکتے جو ایک کلمہ گو مسلمان کے ساتھ رکھنے چاہیں۔ ورنہ بہت سی احادیث میں بلاوجہ کسی مسلمان کی تکفیر کرنے کی سخت مذمت کی گئی ہے اور اسے گناہان کبیرہ میں سے جانا گیا ہے۔

مسلمان کی تکفیر کے متعلق قرآن وسنت کے احکام

اسلامی معاشرے میں مسلمانوں کی تکفیراور اُن پر کفر وشرک کی تہمتیں مسلمانوں کے درمیان عدم تفاہم اور بد اعتمادی کی علامت ہے۔ جس معاشرے میں دلیل واستدلال، صداقت و اخوت اور بھائی چارے ومہربانی کے بجائے سوء ظن وبد بینی، کینہ وعداوت اور جاہ طلبی واستبداد کی فضا حاکم ہو تواس معاشرے کے اجتماعی تعلقات دن بدن کمزور ہوتے جاتے ہیں اور اس کی بنیادیں کھوکھلی ہوتی جاتی ہیں اور وہ معاشرہ ایک دینی وایمانی معاشرے کے بجائے منافق و بے ایمان معاشرے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور پھر اس معاشرے میں دشمنان اسلام وقرآن کے لئے کفر وشرک کے منصوبوں کی تکمیل کرنے کے تمام راستے ہموار ہو جاتے ہیں۔

دین اسلام نے ہمیشہ مسلمانوں کے درمیان مضبوط تعلقات برقرار رکھنے کی سعی کی ہے اور اُنہیں ایک دوسرے پر اعتماد کرنے اور ایک دوسرے کے نزدیک ہونے کی تلقین کی ہے۔ اسلام و قرآن کی تمام تعلیمات خواہ وہ عبادت سے متعلق ہوں یا معاش و سیاست سے، اُن میں اجتماعی روح اور باہمی روابط کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ قرآن کی آیات سے لے کر پیغمبر اکرم (ص) کی احادیث وفرامین اور سیرت و سنت تک تمام اسلامی تعلیمات میں مسلمانوں کو باہمی بھائی چارے اور ایک دوسرے پر اعتماد کی دعوت دی گئی ہے اور بلاوجہ کسی مسلمان کو مسلمین کے جرگے سے خارج کرنے اور اس سے کفر و شرک کی نسبت دینے کی سخت مذمت کی گئی ہے۔اس سلسلے میں قرآن مجید کی چندآیات پیش کرنے کے بعد فریقین کی کتب حدیث وسیرت سے کچھ روایات بھی نقل کی جاتی ہیں:

قرآن اور مسلمانوں کے باہمی روابط

قرآن مجید مؤمنین کے درمیان الفت و محبت کی برقراری کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک معجزہ قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے:

’’هُوَ الَّذِیۤ اَیَّدَكَ بِنَصۡرِهٖ وَبِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَاَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ لَوۡ اَنۡفَقۡتَ مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مَّاۤ اَلَّفۡتَ بَیۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیۡنَهُمۡ اِنَّهٗ عَزِیۡزٌ حَكِیۡمٌ۔‘‘

یعنی؛'' وہی ہے جس نے تمہیں اپنی اور مؤمنین کی مدد سے تقویت پہنچائی اور ان کے دلوں میں الفت پیدا کر دی اور اگر تم دلوں میں الفت پیدا کرنے کے لئے روئے زمین کی تمام چیزوں کو صرف کر دیتے تو ایسا نہ کر سکتے لیکن اللہ نے ان کے درمیان الفت پیدا کر دی، وہ توانا و حکیم ہے۔ (8)

'' وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا۔''

یعنی؛'' اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور جدا جدا نہ ہو جاؤ۔ اللہ نے جو نعمت تمہیں عطا کی ہے، اس کی یاد سے غافل نہ ہو جانا۔ تمہارا حال یہ تھا کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، لیکن اس کے فضل و کرم سے ایسا ہوا کہ بھائی بھائی بن گئے۔'' (9)

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ ایمانداروں کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے: '' اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ۔۔۔۔'' یعنی؛ '' مؤمنین تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔'' (10) ایک اور مقام پر قرآن مجید انتہائی واضح الفاظ میں اہل اسلام کی تکفیر سے نہی کرتے ہوئے فرماتا ہے: '' وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا۔'' (11) یعنی: '' اور اس شخص کو جو صلح و اسلام کا اظہار کرتا ہے، اسے یہ نہ کہو تو مسلمان و مومن نہیں ہے۔'' یعنی؛ ''جو لوگ ایمان کا اقرار کرتے ہیں، انھیں خندہ پیشانی سے قبول کر لو اور ان کے قبول اسلام کے بارے میں ہر قسم کی بدگمانی اور سوء ظن سے صرف نظر کر لو۔'' (12)

مذکورہ بالا آیات واضح طور پر مسلمانوں کے درمیان اخوت و برادری کا رشتہ برقرار کر رہی ہیں اور اُنہیں اس رشتے اور تعلق کو باقی رکھنے کی تاکید کرتی ہیں۔ لہٰذا جو لوگ اپنے من پسند معیار کو دلیل بنا کر مسلمانوں کے درمیان اس تعلق و رشتے کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور اپنے معیار اور سلیقے کے اوپر منطبق نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی تکفیر کے ذریعے اُنہیں مسلمین کے جرگے سے خارج کرنا چاہتے ہیں، کیا وہ قرآن کے ان واضح احکامات کی خلاف ورزی نہیں کر رہے؟ قرآن کی انہی آیات اور احکام کی عملی تفسیر کرتے ہوئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُن کے جانشین ائمہ اطہارؑ بھی اپنے فرامین میں

مسلمانوں کے درمیان اسی ایمانی رشتے کو مضبوطی کے ساتھ قائم رکھنے کی تاکید فرماتے ہیں اور مسلمان کی تکفیر کو گناہ کبیرہ قرار دیتے ہیں:

کلمہ گو مسلمان کی تکفیر کی مذمت میں روایات

مسلمانوں کے درمیان اُخوت وبرادری کا رشتہ فقط ایک احساساتی اور جذباتی پہلو نہیں رکھتا بلکہ ایک ایسا پایدار اور اٹوٹ رشتہ ہے، جو ہر ایماندار شخص کی روح وجان کا حصہ ہے اور اس کی فردی ومعاشرتی زندگی کے تمام پہلوئوں کو گھیرے ہوئے ہے۔ ایک مسلمان میں محبت واُخوت، مساوات وبرابری اور تعاون وایثار جیسے تمام معاشرتی جذبات واحساسات اسی ایک رشتے اور تعلق کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر مسلمان کا فریضہ ہے کہ وہ ان ایمانی جذبات واحساسات کی حفاظت کرے اور کوئی ایسا کلمہ وجملہ اپنی زبان پر جاری نہ کرے جس کی وجہ سے اس ایمانی تعلق ورشتے میں رخنہ پیدا ہوسکے۔

اس کے علاوہ ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان کا احترام کرنا چاہیے اور اسلام وکفر کی حدود کو پہچاننا چاہیے تاکہ وہ کسی مسلمان کی طرف کفر کی نسبت نہ دے۔ چونکہ جو بھی توحید اور رسالت کی تصدیق کرتا ہے وہ مسلمان ہے۔ اس سلسلے میں فریقین کی کتب سے چند روایات ملاحظہ کیجئے: امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "۔۔۔الاسلام شهادة ان لا اله الا الله والتصديق برسول الله۔ به حقنت الدماء وعليه جرت المناكح والموريث۔۔۔۔" (13) یعنی: "اسلام نام ہے گواہی دینا توحید کی اور رسول کی۔ اسلام لانے سے خون محفوظ ہو جاتا ہے اور مناکحت درست ہو جاتی ہے اور میراث مل جاتی ہے۔" اسی مضمون کی حدیث بخاری سے بھی نقل ہوئی ہے۔ جس کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"۔۔۔مَن شهد ان لا اله الا الله واستقبل قبلتنا وصلى صلوٰتنا واكل ذبيحتنا فذلك المسلم له ما للمسلم وعليه ما على المسلم۔۔۔" (14)

یعنی: "جو بھی توحید کی گواہی دے، ہمارے قبلہ کی طرف منہ کرے اور ہماری طرح نماز پڑھے اور مسلمانوں کے ذبیحہ کو کھائے، وہ مسلمان ہے لہٰذا جو کچھ مسلمان کے لئے یا اس کے اوپر ہے، اُس کے بارے میں بھی ہے۔"

لہٰذا کلمہ گو مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کا احترام کریں اور آپس میں محبت والفت قائم رکھیں۔ اسی سلسلے میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"یحق علی المسلمین الاجتھاد فی التواصل والتعاون علی التعاطف والمواساۃ لاھل الحاجۃ وتعاطف بعضھم علی بعض حتیٰ تکونوا کما امرکم اللہ عزوجل رحماءُ بینھم۔۔۔" (15)

یعنی: "مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ ایک دوسرے کے دل نزدیک کرنے کے لئے کوشش کریں اور محبت بھرے تعاون سے دریغ نہ کریں اور ضرورت مندوں کے ساتھ مواسات وہمدردی کریں تاکہ اللہ تعالیٰ کے فرمان "رحماء بینھم" کے مصداق قرار پائیں۔"

کتاب صحیح مسلم کے باب "بیان حال ایمان مَن قال لاخیہ المسلم یاکافر" میں آیا ہے کہ عبد اللہ بن عمر سے روایت ہے، رسول اللہؐ نے فرمایا: جب کسی مرد نے اپنے بھائی کو کافر کہا تو وہ کفر دونوں میں سے کسی پر ضرور پلٹے گا۔ (16)

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ملعون ہے ملعون ہے وہ شخص جو کسی مسلمان پر کفر کی تہمت لگائے، مسلمان کی تکفیر، اُسے قتل کرنے کے برابر ہے"۔ (17)

علمائے امامیہ کے نزدیک حدود کفر واسلام

تمام اسلامی مذاہب کے علماء کی طرح علمائے امامیہ نے بھی اسلام وکفر کی حدود معین کرتے ہوئے کلمہ شھادتین کہنے والے کو مسلمان اور اس کے خون ومال وناموس کو محترم قرار دیا ہے۔ جیسا کہ شیخ صدوق کتاب "ھدایہ" میں لکھتے ہیں:

"الاسلام ھو الاقرار بالشھادتین وھو الذی یُحقن بہ الدماء والاموال ومَن قال لا الہ الاّ اللہ محمد رسول اللہ(ص) حُقن مالہ ودمہ"

یعنی: "اسلام، شھادتین کی گواہی دینے کا نام ہے اور اس کے زریعے جان ومال محفوظ ہو جاتے ہیں اور جو بھی لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ کہے اُس کی جان ومال محفوظ ہے۔"

اسی طرح شیخ مفید کتاب "اوائل المقالات" میں محقق" شرائع "میں، صاحب جواہر کتاب "جواھر الکلام" میں اور آیت اللہ حکیم "مستمسک" میں توحید ورسالت کی گواہی دینے والوں کو مسلمان جانتے ہیں اور ان کے خون ومال وناموس کو محترم سمجھتے ہیں۔

فقہ امامیہ میں کس کی تکفیر جائز ہے کس کی جائز نہیں؟

بعض گروہ یا مذاہب کہ جن کی تکفیر کے بارے میں فقہ امامیہ میں بحث کی جاتی ہے کہ ان میں سے کس کی تکفیر جائز ہے اور کس کی تکفیر جائز نہیں؟ فقہائے امامیہ کے نزدیک جن کی تکفیر جائز نہیں وہ یہ ہیں:

ا۔ تازہ مسلمان

اگر کوئی تازہ تازہ مسلمان ہوا ہو اور پھر چار اسباب تکفیر میں سے کسی ایک کا مرتکب ہو جائے تو اس کی تکفیر جائز نہیں ہے۔ چونکہ ابھی وہ اسلام اور اُس کی بنیادی تعلیمات اور اصولوں سے پوری طرح آگاہ نہیں ہوا۔ لہٰذا کم معلومات کی وجہ سے اُس کی تکفیر جائز نہیں ہے۔

۲۔ منکر وصایت وجانشینی حضرت علی علیہ السلام

اگرچہ حضرت علی علیہ السلام کی وصایت وجانشینی کا عقیدہ مذہب امامیہ وشیعہ اثنا عشریہ کی ضروریات میں سے ہے، لیکن فقہائے امامیہ اس نص اور جانشینی کے انکار کی وجہ سے کسی مسلمان کی تکفیر کو جائز نہیں سمجھتے، چونکہ تمام معصومین علیہم السلام اور اُن کے بعد فقہائے عظام کی سیرت وروش یہی تھی کہ وہ تمام کلمہ گو مسلمانوں اور دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ اسلامی معاشرت اختیار کرنے کی تاکید فرماتے تھے اور معصومینؑ کی سیرت اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اس لئے اہل سنت کے چار مذاہب کے علاوہ دوسرے شیعہ وسنی فرقوں مثلاً زیدیہ، اسماعیلیہ، واقفیہ، حتیٰ (خوارج کے علاوہ) جن مسلمانوں نے جمل وصفین حضرت علی (ع) سے جنگ کی ہے، اُن کی تکفیر بھی جائز نہیں ہے اور وہ سب امامیہ کے نزدیک مسلمان ہیں۔ (18) جن گروہوں کی تکفیر کی جاسکتی ہے وہ یہ ہیں:

ا۔ خوارج

وہ گروہ جس نے حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کے خلاف قیام کیا تھا اور حضرت علیؑ اور آپ کی پیروی کرنے والے دیگر مسلمانوں کو جنگ صفین میں تحکیم قبول کرنے کی وجہ سے واجب القتل قرار دیا تھا۔

فقہائے امامیہ خوارج کی تکفیر اس لئے کرتے ہیں چونکہ انہوں نے حضرت علی علیہ السلام اور دوسرے صحابہ کرام اور مسلمانوں کو واجب القتل سمجھا تھا۔ اسی طرح خوارج کے بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: ''اِنّھُم یَمْرُقُونَ مِن الدِّینِ کَمایَمْرُقُ السَّھمُ مِن الرَّامی'' یعنی : ''یہ دین سے اسی طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔'' یہ حدیث بہت سی کتب حدیث وتاریخ میں ذکر ہوئی ہے۔ (19) لہٰذا یہ حدیث بھی خوارج کی تکفیر کی ایک اہم دلیل ہے۔

۲۔ نواصب

یہ وہ گروہ ہے جو اہل بیت اطہار (ع) اور خاندان رسول (ص) کے بارے میں بغض وکینہ اور عداوت ودشمنی رکھتا ہے اور اُن کی محبت و مودّت سے اظہار بیزاری کرتا ہے۔ فقہائے امامیہ اُن آیات اور احادیث نبوی (ص) سے استناد کرتے ہوئے کہ جن میں اہل بیت اطہار (ع) سے محبت و مودّت اور ان کی اطاعت کرنے کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے، اس گروہ کی بھی تکفیر کرتے ہیں۔

البتہ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ امامیہ فقہاء کا نواصب کو کافر قرار دینے کا قطعاً مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اہل سنت والجماعت کے بارے میں بھی ایسی رائے رکھتے ہیں، بلکہ ایسا عقیدہ رکھنا سراسر غلط ہے، کیونکہ اہل سنت و الجماعت اور نواصب میں فرق ہے اور ہمارے نزدیک اہل سنت میں سے کوئی بھی اہل بیت اطہار (ع) سے نفرت نہیں کرتا، بلکہ اُن کی محبت کو فرض سمجھتا ہے۔ عصر حاضر کے بعض ناصبی گروہوں نے اہل سنت کو مغالطے میں ڈالنے کے لئے خود کو اہل سنت ظاہر کرتے ہوئے امامیہ کے اس نظریئے کو اہل سنت کے بارے میں مشہور کر رکھا ہے، لیکن ہر پڑھا لکھا سنی مسلمان خود بھی جانتا ہے کہ ناصبیوں اور اہل سنت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس سلسلے میں ناصبیوں کے بارے میں خود اہل سنت علماء کی کتابوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔

۳۔ بت پرست، ستارہ پرست اور دھریہ فرقہ

ان لوگوں کی تکفیر کے بارے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں چونکہ یہ بتوں، ستاروں اور دھر کی خالقیت کے قائل ہیں۔ لہٰذا فقہائے امامیہ توحید پروردگار کے منکرین کے کفر پر اجماع رکھتے ہیں۔

۴۔ مُجسّمہ و مشبّھہ

یہ وہ لوگ ہیں جو دیگر مخلوقات کی طرح اللہ تعالیٰ کی جسمانیت کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ جس کی تفصیل کلامی کتب میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کے کفر پر بھی فقہائے امامیہ کا اجماع ہے۔

۵۔ مجبّرہ

اس گروہ کا عقیدہ ہے کہ انسان کسی قسم کا اختیار نہیں رکھتا اور خدا اُس سے ہر اچھا بُرا کام جبراً کراتا ہے۔ اس قسم کے عقیدے کی بازگشت اللہ تعالیٰ کے عادل ہونے کی نفی اور (نعوذ باللہ) اس کے ظالم ہونے کی طرف ہوتی ہے۔ اس گروہ کی تکفیر کے بارے میں علمائے امامیہ میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بعض کا کہنا ہے چونکہ ان کے اس عقیدہ کا لازمہ بنیادی ترین ضروریات دین کا انکار ہے، لہٰذا ان کے کفر کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ لیکن بعض دوسرے فقہائے امامیہ، ان کے اس عقیدے کو باطل جاننے کے باوجود ان کی تکفیر کا حکم نہیں لگاتے چونکہ یہ لوگ اپنے فہم کے مطابق قرآن کی بعض آیات (مثلاً سورۂ بقرہ کی آیت: ۱۳۴، ۱۸۶، سورۂ انعام کی آیت: ۱۶۴ اور سورۂ طور کی آیت ۲۱) کو اپنے عقیدے کی دلیل قرار دیتے ہیں، اگرچہ وہ ان آیات کی تفسیر میں عقلانیت کو مد نظر نہیں رکھتے۔ لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت، قیامت کے ثواب و عقاب پر ایمان رکھتے ہیں، اس لئے انہیں کافر نہیں کہا جا سکتا۔

البتہ اس عقیدے کے معتقدین میں اشعری مذہب کے پیروکار کی تعداد زیادہ ہے جو اہل سنت کے کلامی مذاہب میں سے ہیں۔ اس کلامی گروہ کے بارے میں ائمہ اطہار علیہم السلام اور اُن کے پیروکار فقہائے عظام کی سیرت و روش کو دیکھا جائے تو وہ انہیں مسلمان ہی سمجھتے تھے اور ان کے ساتھ فقہی و کلامی بحث و مباحثہ کے باوجود اسلامی معاشرت کے قائل تھے۔

۶۔ مفوّضہ

یہ جبریوں کے بالکل برعکس عقیدہ رکھتے ہیں اور انسان کو اپنے تمام افعال کا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ اس گروہ کی بھی جبریہ کی مانند اپنے عقیدے کے عقلی لازمے پر اعتقاد نہ رکھنے کی صورت میں تکفیر نہیں کی جا سکتی اور ان کے ساتھ بھی فقہاء مسلمانوں والا رویہ اختیار کرنے کی تاکید کرتے ہیں، چونکہ یہ بھی کلمہ شہادتین کی وجہ سے جرگہ مسلمین میں شامل ہیں۔

۷۔اللہ تعالیٰ کو دشنام دینے والے

تمام مسلمان مذاہب کی طرح امامیہ بھی اللہ تعالیٰ کو دشنام دینے والے اور استہزاء کرنے والوں کے کفر پر اتفاق نظر رکھتے ہیں۔اس کی دلیل قرآن مجید کی یہ آیت ہے:

"قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ۔ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ"

یعنی؛ "کہہ دیجئے! کیا اللہ، اس کی آیتیں اور اس کا رسول ہی تمہارے ہنسی مذاق کے لئے رہ گئے ہیں، تم بہانے نہ بناؤ یقینا تم اپنے ایمان کے بعد بے ایمان ہو گئے۔"(20)

۸۔پیغمبر اکرم (ص) کو دشنام دینے والا

تمام مسلمانوں کا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دشنام دینے والے کے کفر پر اجماع ہے۔اسی طرح اگر کوئی شخص آپ (ص) کے ساتھ کوئی بُری اور ناروا بات منسوب کرے یا آپ کی ازواج میں سے کسی ایک کی طرف (نعوذ باللہ) زنا و بدکاری کی نسبت دے، وہ کافر اور واجب القتل ہے۔

۹۔ائمہ طاہرین اور حضرت فاطمہ الزہراء علیہم السلام کو دشنام دینے والا

ان ذوات مقدسہ کو دشنام دینے والے کے بارے میں بھی فقہائے امامیہ کا اجماع ہے کہ وہ کافر اور واجب القتل ہے۔

۱۰۔انبیائے کرام علیہم السلام کو دشنام دینے والا

خواہ اولوالعزم انبیاء ہوں یا غیر اولوالعزم کو دشنام دینے والا بھی تمام مسلمانوں کے نزدیک کافر ہے۔

۱۱۔ملائکہ اور فرشتوں کو دشنام دینے والا

ملائکہ کے دشنام دہندہ کی تکفیر بھی جائز ہے۔

۱۲۔ہتک حرمت اسلام

تمام فقہائے امامیہ کے نزدیک جو شخص بھی اپنے کسی قول و فعل کے ذریعے دین اسلام کی توہین کرے اور دوسرے مسلمانوں کے سامنے اسلامی تعلیمات کو سبک و پست کہے کہ جس سے اسلام کے بارے میں بدگمانی پھیلے تو ایسے شخص کی تکفیر بھی جائز ہے۔

۱۳۔غلات

ایسے مسلمان جو حضرت علی علیہ السلام اور دوسرے ائمہ معصومین علیہم السلام کے بارے میں افراط پر مبنی عقیدہ رکھتے ہیں اور ان ذوات مقدسہ کے بارے میں ایسے خیالات کا اظہار کرتے ہیں جو انہیں اُلوہیت (خدائی) کے درجے تک پہنچا دیتے ہیں۔ان کی تکفیر کے بارے میں فقہائے امامیہ کا اجماع ہے۔اور ان کی تکفیر کی سب سے بڑی دلیل خود امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی سیرت وروش ہے چونکہ حضرت علی (ع) اور دوسرے ائمہ طاہرین علیہم السلام نے ان غالیوں کی تکفیر کی ہے اور ان کے عقائد سے برائت کا اظہار فرمایا ہے۔ائمہ طاہرین علیہم السلام سے منقول روایات کی وجہ سے تمام شیعہ فقہاء نے بھی غلات کی تکفیر کی ہے۔ چنانچہ امام خمینیؒ اس بارے میں لکھتے ہیں:

"واما الغالی فان کان غلوہ مستلزماً لانکار الالوھیۃ او التوحید او النبوۃ فھو کافر والافلا۔" (21)

یعنی: "لیکن جہاں تک غالی کا تعلق ہے تو اگر اس کا غلّو انکار خدا، انکار توحید یا نبوت کے انکار کا موجب بنے تو وہ کافر ہے، وگرنہ کافر نہیں ہے۔"

اسی طرح غالیوں سے متعلق ایک سوال کے جواب میں آیت اللہ العظمٰی سید علی خامنہ ای لکھتے ہیں:

"القول بألوھیّۃ مولیٰ الموحّدین (علیہ الصلاۃ والسلام) عقیدۃ باطلۃ، وموجبۃ لخروج المعتقد بھا من الاسلام، والمساعدۃ علیٰ ترویج ھذہ العقیدہ الفاسدۃ حرامٌ، مضافاً اِلیٰ أنّہ لا یجوز صرف المال المنذر فی غیر جھۃ النذر۔" (22)

یعنی: "مولائے موحدین (حضرت علی علیہ السلام) کو خدا ماننے کا عقیدہ باطل ہے اور ایسا عقیدہ رکھنے والا اسلام سے خارج ہے۔ایسے فاسد عقیدے کی ترویج میں مدد کرنا حرام ہے، مزید یہ کہ اگر مال کو کسی خاص مورد کے لئے نذر کیا گیا ہو تو اسے کسی دوسری جگہ پر خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔

*****

حوالہ جات

1۔علامہ وحید الزمان، لغات الحدیث، کتاب ''ک''

2۔سورۂ بقرہ، ۱۷۷

3۔سورۂ بقرہ، ۲۲۸

4۔سورۂ نساء، ۵۹

5۔ خمینی، روح اللہ، تحریر الوسیلہ، ج ۱، ص ۲۱۰

6۔خامنہ ای، علی، اجوبۃ الاستفتائات، ج ۱، ص ۱۹۵

7۔فرھنگ فقہ، ج ۱، ص ۴۶۳، بحوالہ جواھر الکلام، ج ۴۱، ص ۶۰۰

8۔سورۂ انفال، ۶۲

9۔سورۂ آل عمران، ۱۰۳

10۔سورۂ حجرات، ۱۰

11۔سورۂ نساء، ۹۴

12۔مکارم، شیرازی، تفسیر نمونہ، ج ۴، ص ۷۵، مترجم سید صفدر حسین نجفی

13۔کلینی، اصول کافی، ج ۲، ص ۲۵ الطبعۃ القدیمۃ

14۔شرف الدین، فصول المھمہ، ص ۱۳، بحوالہ صحیح بخاری

15۔عاملی، شیخ حر، وسائل الشیعہ ج ۸، ص ۵۵۲

16۔ صحیح مسلم شریف، جلد اول، ص ۱۶۶، مترجم علامہ وحید الزمان
(ترجمہ علامہ وحید الزمان، ناشر: خالد احسان پبلشرز لاہور، اگست ۲۰۰۴ء)

17۔ مجلسی، باقر، بحار الانوار، ج ۷۲، ص ۲۰۹

18۔تفصیل کے لئے دیکھئے: دائرۃ المعارف تشیع، ج ۵، ص ۴۷، ۴۸

19۔تاریخ ابن کثیر (البدایہ والنہایہ) ج ۴، ص ۲۷۲ (اُردو ترجمہ، نفیس اکیڈیمی، کراچی)
سیرت امیر المومنین، مفتی جعفر حسین، ج ۱، ص ۶۴۴، بحوالہ بخاری، ج ۴، ص ۱۳۴)

20۔سورۂ توبہ، آیت ۶۶

21۔ خمینی، روح اللہ، تحریر الوسیلہ، ج ۱، ص ۲۱۳

22۔خامنہ ای، علی، اجوبۃ الاستفتائات، ص ۹۷

اطاعت امیر کا نظریہ اور حضرت امام حسینؑ کا موٴقف

ڈاکٹر زاہد علی زاہدی☆ ڈاکٹر عباس حیدر زیدی☆*

خلاصہ

ہر دور میں جہاں حکمرانوں نے رعایا پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے مذاہب کا سہارا لیا ہے اور خود کو ایک ایسی ہستی بنا کر پیش کیا ہے کہ جس کا رابطہ مافوق الفطرت قوتوں سے ہو، وہاں حقیقتِ حال سے ناآشنا عوام نے بھی حکمرانوں کے اچھے برے اعمال پر نظر رکھے بغیر انہیں یہ اعزاز بخشا ہے۔یزید کے دورِ حکومت میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔یزید کے فاسق و فاجر، زانی و شرابی، کتوں اور بندروں سے کھیلنے والا اور گانے بجانے جیسی بیہودہ حرکتیں انجام دینے والا ہونے کے باوجود بھی مسلمان امت کی ایک کثیر تعداد نے اسے اپنا امیر مانا اور اس اطاعت کو واجب قرار دیا۔ایسا اس لیے ہوا کہ بنی امیہ نے بعض ایسے درباری مفسر اور محدث جمع کر لیے تھے جو احادیث اور قرآن کی آیات سے غلط استفادہ کرتے ہوئے بنی امیہ کے ظالم حکمرانوں کی اطاعت کو بھی واجب قرار دیتے تھے۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ لوگ جو یزید کے حکم پر حضرت امام حسین علیہ السلام کے خلاف جنگ لڑ رہے تھے، وہ اپنے خیال میں اپنے کام کو مذہب کے عین مطابق تصور کر رہے تھے۔

بد قسمتی سے آج بھی مسلمانوں کے ایک طبقے کا خیال ایسا ہی ہے اور وہ بعض حدیثوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وقت کے ہر حکمران کی اطاعت واجب ہے خواہ وہ ظالم ہی کیوں نہ ہو۔اسی طرح بعض مسلمان مفکرین ''اولی الامر'' کی تفسیر میں سرگرداں ہیں اور ان کے درمیان اس بات میں کافی اختلاف ہے کہ اولی الامر کون ہیں جن کی اطاعت واجب ہے۔ایک گروہ کا خیال ہے کہ وقت کا ہر حکمران اولی الامر ہے، اس کی اطاعت واجب ہے اور اس کے خلاف کوئی بھی انقلابی تحریک بغاوت ہے؛ خواہ وہ حاکم ظالم و جابر ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے قیام کے ذریعے اطاعت امیر کے اِس نظریہ کو ٹھکرا دیا۔آپ نے واضح کیا کہ وہ شخص مسلمان امت کی حکمرانی کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا جو کتاب خدا پر عمل نہ کرے، ظالم ہو، حق کی پیروی نہ کرے اور اپنے وجود کو اللہ کے لئے وقف نہ کر دے۔لہٰذا ایسے حاکم کے خلاف قیام، بغاوت نہیں جہاد ہے۔

*۔☆استاد علوم اسلامی، جامعہ کراچی، ☆استاد مطالعہ پاکستان، جامعہ کراچی

مذاہب کی تاریخ کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ مختلف ادوار میں حکمرانوں نے اپنی رعایا پر گرفت مضبوط کرنے کے لیے مذاہب کا سہارا لیا اور خود کو ایسا مقدس بنا کر پیش کیا کہ عام انسان یہ سمجھیں کہ حکمران عام انسان نہیں بلکہ کوئی مافوق الفطرت ہستی ہیں یا کم از کم ان کا رابطہ مافوق الفطرت قوتوں سے ہے۔ کبھی تو انہوں نے خود کو دیوتا قرار دیا، کبھی دیوتاؤں کے خاندان سے رشتہ جوڑا اور کبھی ان کا خصوصی منظور نظر ٹھہرایا۔ یہاں تک کہ مسلمان حکمران بھی ظل الٰہی (خدا کا سایہ) کہلائے جبکہ اسلام نے جس خدا کا تصور پیش کیا ہے وہ ”لیس کمثلہ شئی “ ہے جس کا سایہ ہی ممکن نہیں۔

البتہ اسلام میں حکومت اور سیاست کا جو نظام ہے اس کے مطابق جب ایک اسلامی حکومت کا سربراہ کوئی حکم صادر کرے تو جس طرح معاشرتی نظم کا تقاضا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اسی طرح شریعت کا تقاضا بھی ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے تاکہ معاشرے میں حرج و مرج نہ ہو۔ یہاں تک کہ جو اس حکمران سے علمی اختلاف رکھتا ہو اس کو بھی اطاعت سے گریز نہیں کرنا چاہئے تاکہ نظام کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ لیکن اسی چیز کو بنیاد بنا کر کچھ ایسے حکمران جو ظلم اور جبر کے بل بوتے پر عوام پر مسلط ہو گئے اور فسق و فجور کا بازار گرم کیا، حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دے دیا، سنتوں کو بدعتوں سے بدل دیا اور بے گناہوں کے خون سے اپنے ہاتھوں کو رنگین کیا، انہوں نے بھی اپنی غیر مشروط اطاعت و فرمانبرداری کو عوام پر واجب قرار دے دیا اور انہی دلیلوں کو اپنے حق میں پیش کیا جن کو حقیقی اسلامی حکومت کے امیر کی اطاعت کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔

ایسے حکمرانوں کی ایک طویل فہرست ہے تاہم مضمون کے اختصار کے پیش نظر زیر نظر مقالہ میں ہم صرف یزید بن معاویہ کے دور کے حوالے سے اس موضوع پر اظہار خیال کریں گے۔ یزید کے بارے میں تاریخ متفق ہے کہ وہ فاسق و فاجر تھا، زانی و شرابی تھا، کتوں اور بندروں سے کھیلتا تھا، گانے سنتا تھا اور طنبورے بجاتا تھا اور امام حسینؑ نے واضح طور پر اس کے لیے کہا تھا کہ ایسا شخص امت مسلمہ کی قیادت و رہبریت کے لیے کسی طرح بھی موزوں نہیں ہے تاہم ایک طبقہ اسی دور میں یزید کی اطاعت کے لیے راہیں ہموار کرنے میں لگا رہا اور اس نے ایسی حدیثیں بھی پیش کر دیں کہ جس میں ہر حکمران کی اطاعت واجب قرار

دی گئی ہے خواہ وہ ظالم ہی کیوں نہ ہو۔ بعد میں جب احادیث کے مجموعے تیار ہوئے تو بعض چیزیں ان میں بھی آگئیں۔ مثلاً صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''میرے بعد ایسے امام ہوں گے جو میرے طور طریقوں پر نہیں چلیں گے اور میری سنت قبول نہیں کریں گے۔ ان میں سے ایسے آدمی ہوں گے جن کے دل شیطان کے اور بدن انسانوں کے ہوں گے۔ حذیفہ کا کہنا ہے کہ میں نے کہا: یارسول اللہ! اگر میں اس زمانے میں زندہ ہوں تو کیا کروں؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تمہیں چاہئے کہ امیر کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ اگرچہ وہ تمہیں تازیانے لگائے اور تمہارا مال چھین لے، پھر بھی اس کی اطاعت کرو اور اس کے فرمانبردار رہو۔'' (1)

اسی طرح ایک روایت یہ بھی بیان کی گئی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''مَنْ رَأَی مِنْ أَمِیرِہِ شَیْئًا یَکْرَھُہُ فَلْیَصْبِرْ عَلَیْہِ فَإِنَّہُ مَنْ فَارَقَ الجَمَاعَۃَ شِبْرًا فَمَاتَ، إِلَّا مَاتَ مِیتَۃً جَاھِلِیَّۃً۔''

یعنی: '' جو شخص اپنے امام سے کوئی ایسی چیز دیکھے جس سے وہ نفرت کرتا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ صبر کرے کیونکہ جو شخص جماعت سے ایک قدم یا ایک بالشت دور ہو جائے وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔'' (2)

یہی حدیث صحیح مسلم میں بھی موجود ہے۔ (3)

حکمرانوں کی مطلق اطاعت کا نظریہ اس قدر راسخ ہو چکا تھا کہ اس کے خلاف کسی بھی طرح کی مخالفت کو بغاوت قرار دیا جاتا تھا اور باغی کی سزا یعنی موت اس کا مقدر ہوتی تھی۔ بنی امیہ نے اپنی اطاعت کے لیے ایسی باتوں کو اس قدر عام کیا کہ اس کے تمام کارندے اپنے ہر ظلم و ستم کی توجیح اسی فلسفہ کے ساتھ کرنے لگے اور خود کو مومن اور پارسا سمجھنے لگے۔ یہاں تک کہ امام حسینؑ جیسے جوانان جنت کے سردار اور فرزند پیغمبر کو قتل کرنے کے لیے بھی یہی تاویل پیش کی گئی کہ وہ امیر کی اطاعت سے نکل گئے۔ جب حاکم کوفہ نعمان بن بشیر کو معلوم ہوا کہ لوگ حضرت مسلم بن عقیل (ع) کی تیزی سے بیعت کر رہے ہیں تو اس نے منبر جا کر تقریر کی اور کہا:

''وَنَکَثْتُمْ بَیْعَتَکُمْ، وَخَالَفْتُمْ إِمَامَکُمْ فَوَاللہِ الَّذِی لَا إِلَہَ غَیْرُہُ لَأَضْرِبَنَّکُمْ بِسَیْفِی۔''

یعنی: " اگر تم نے میری کھلم کھلا مخالفت شروع کر دی اور اپنے امام (یزید) کی بیعت توڑ دی تو میں تمہیں اپنی تلوار سے ماروں گا۔" (4)

مسلم بن عمرو باہلی کہ جس کا مرتبہ یزید کے نزدیک بہت بلند تھا، اس نے حضرت مسلم بن عقیل (ع) سے کہا:

"أَنَا مَنْ عَرَفَ الْحَقَّ إِذْ تَرَكْتَهُ وَنَصَحَ الْأُمَّةَ وَالْإِمَامَ إِذْ غَشَشْتَهُ، وَسَمِعَ وَأَطَاعَ إِذْ عَصَيْتَهُ۔"

یعنی: " میں وہ شخص ہوں جو حق کو جانتا ہوں حالانکہ تو نے اس کا انکار کیا ہے اور میں وہ شخص ہوں جس نے امت اور امام کی خیر خواہی چاہی جب تو نے دھوکہ کیا؛ اور میں وہ شخص ہوں جس نے امام کی پیروی کی؛ جب تو نے اس کی مخالفت کی ہے۔" (5)

معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ جب مالک بن نسیر نامی شخص ابن زیاد کا خط لے کر حر کے پاس پہنچا تو اس نے حر کو تو سلام کیا لیکن امام حسین علیہ السلام کو سلام نہ کیا۔ اس کی اور امام حسین علیہ السلام کے ساتھی یزید بن زیاد بن مہاصر ابوالشعشاء کندی میں اس طرح گفتگو ہوئی۔ ابوالشعشاء نے کہا "ثكلتك امك لماذا جئت فيه" یعنی: "تیری ماں تجھ پر روئے یہ تو کس کام کے لئے آیا ہے؟" اس نے جواب دیا: "وما جئت فيه أطعت امامي و وفيت ببيعتي" یعنی: "میں اور کس کام کو آیا ہوں؟ میں نے اپنے امام کی اطاعت کی اور بیعت کو پورا کیا۔" (6)

ابوالشعشا نے کہا کہ:

" عصيت ربك وأطعت امامك في هلاك نفسك كسبت العار و النار قال الله عزو جل وجعلناهم أئمة يدعون الى النار و يوم القيامة لاينصرون۔ فهو امامك۔"

یعنی: " تو نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی اور اپنے امام کی اطاعت کرکے اپنی ہلاکت کا سامان کیا۔ تو نے دنیا کی فضیحت اور عذاب آخرت دونوں کو مول لے لیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: "ایسے امام بھی ہیں جو لوگوں کو آتش جہنم کی طرف دعوت دیتے ہیں اور روز قیامت ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ ان معنوں سے بیشک وہ تیرا امام ہے۔" (7)

تاریخ طبری میں ہے کہ روز عاشور جب امام حسین علیہ السلام زخموں سے چور ہو کر زمین پر تشریف لائے تو مالک بن نسیر نے ہی حضرت کے سر اقدس پر تلوار لگائی جو عمامہ کو کاٹ کر سر میں اتر آئی اور تمام عمامہ خون سے تر ہو گیا۔ اس ظالم نے اپنے اسے بدترین عمل کی توجیح یہ کہہ کر کی کہ ''میں نے اپنے امام کی اطاعت کی اور بیعت کو پورا کیا''اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ یزید کو امام وقت سمجھتے ہوئے اس کی بیعت کا خود کو پابند سمجھتا تھا۔ امام حسین علیہ السلام کے ساتھی بریر ابن خضیر کو کعب بن جابر عمر واز دی نے شہید کیا۔ جب وہ واقعہ کربلا کے بعد اپنے گھر کوفے میں واپس پہنچا تو اس کی بیوی یا بہن نوار بنت جابر نے اس سے ناراضگی ظاہر کی تو اس موقع پر اس نے اشعار کہے، جس کے آخر میں اس نے کہا:

''فأبلغ عبيدالله ما لقيته۔۔۔ بأني مطيع للخليفة سامع''

یعنی: '' کوئی میرا پیغام ابن زیاد سے مل کر پہنچا دے کہ میں بجان ودل خلیفۂ وقت کا مطیع و تابع فرمان ہوں''۔(8)

کعب کے یہ اشعار اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ وہ خلیفہ وقت جو کہ یزید تھا، اس کی اطاعت کو واجب گردانتا تھا۔ سید الشہداء علیہ السلام کی دشمنی میں آئے ہوئے اکثر یزیدی قتل حسین کے لیے یہی جواز کافی سمجھتے تھے اور اس فعل قبیح کے لیے اپنے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے یہی نعرہ لگاتے تھے۔ ایک موقع پر لشکر یزید میں عمر بن الحجاج نے کھڑے ہو کر آواز دی:

''يا أهل الكوفة الزموا طاعتكم وجماعتكم ولا ترتابوا في قتل من مرق من الدين وخالف الامام۔''

یعنی: '' اے اہل کوفہ امیر کی اطاعت اور اپنی متفقہ رائے پر سختی سے قائم رہو اور کوئی شک نہ کرو ان لوگوں کے قتل میں جو مذہب سے نکل گئے ہیں اور امام کی مخالفت کر رہے ہیں''۔(9)

اس پر امام حسین علیہ السلام نے فرمایا:

''يا عمرو بن الحجاج أ تحرض الناس؟ أنحن مرقنا وأنتم ثبتم عليه أما والله لتعلمن لو قد قبضت أرواحكم و متم على أعمالكم أيّنا مرق من الدين ومن هو أولى بصلى النار۔''

یعنی: " اے عمرو بن الحجاج تو میری جنگ کے لئے لوگوں کو آمادہ کر رہا ہے؟ کیا ہم دین سے نکل گئے اور تم دین پر باقی ہو؟ خدا کی قسم جب یہ چند روزہ زندگی ختم ہو گی اور موت کا مزہ چکھو گے اس وقت معلوم ہو گا کہ کون دین سے نکلا تھا اور کون آتش جہنم میں سزا پائے جانے کا مستحق ہے"۔ (10)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو لوگ امام حسین علیہ السلام کے خلاف جنگ کر رہے تھے، ان کے افکار میں اپنے امام (حکمران) کی اطاعت ہی عین مذہب تھا۔ شمر بن ذی الجوشن جو قاتلین امام حسین علیہ السلام میں شامل تھا، اس کے بارے میں ابن حجر لکھتے ہیں کہ جب شمر نماز جماعت میں آتا تو نماز کے بعد دعا کرتے ہوئے کہتا تھا: " اللھم انك تعلم أني شریف فاغفر لی۔ یعنی: " خدایا! تو جانتا ہے کہ میں ایک اچھا انسان ہوں لہٰذا میری مغفرت فرما!"

راوی کہتا ہے کہ میں نے اس سے کہا: تو یہ خدا سے کیسے توقع کر سکتا ہے کہ وہ تجھے بخش دے حالانکہ تو نے فرزند رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کیا ہے؟ شمر نے کہا:

"ویحك! فکیف نصنع؟ ان أمرائنا ھؤلاء أمرونا بأمر فلم نخالفھم، ولو خالفناھم کنا شرا من ھذہ الحمر السقاۃ۔"

یعنی: " تو کیا کہتا ہے؟ میں کیا کر سکتا تھا! وہ ہمارا امیر ہے اس نے ہمیں حکم دیا اور اگر ہم مخالفت کرتے تو اس گدھے سے بھی بدتر ہوتے جو پانی کھینچنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔" اس کے بعد ابن حجر اس مطلب کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں: "یہ عذر نہایت ناپسندیدہ ہے کیونکہ اطاعت فقط پسندیدہ اور اچھے کاموں میں ذکر ہوئی ہے"۔ (11)

شمر کے ان جملوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس معاملے میں یہ لوگ کس قدر راسخ العقیدہ تھے اور یزید بن معاویہ جیسے فاسق و فاجر حکمران کی اطاعت کو خدا و رسول کی اطاعت کی طرح سمجھتے تھے اور اس بات پر فخر کرتے تھے نیز کسی بھی مرحلے میں شرمندہ نہیں ہوتے تھے۔ اسی قسم کی ایک روایت کو ابن عساکر نے اپنی "تاریخ دمشق" میں بھی بیان کیا ہے۔ (12)

جب حضرت امام حسین علیہ السلام شہید کر دیئے گئے اور اہل حرم کو اسیر کرکے دربار ابن زیاد میں لایا گیا تو اس نے اعلان کروایا کہ لوگ مسجد جامع میں جمع ہوں۔ اس موقع پر اس نے منبر پر جا کر جو تقریر کی اس کے افتتاحی جملے اس طرح تھے:

”الحمد لله الذی أظهر الحق وأهله ونصر أمير المؤمنين يزيد بن معاوية وحزبه وقتل الكذاب ابن الكذاب الحسين بن علی وشيعته۔“

یعنی: ” خدا کا شکر ہے، جس نے حق اور اہل حق کو فتح عنایت کی اور خلیفہ وقت یزید بن معاویہ اور ان کے گروہ کی مدد فرمائی اور۔۔۔ حسین ابن علیؑ کو ان کے شیعوں سمیت قتل کیا۔“ (13)

یہاں ہم نے تاریخ طبری سے عبیداللہ ابن زیاد کے اصل جملے نقل کر دیئے ہیں لیکن ابن زیاد نے حضرت امام حسین (ع) اور ان کے والد حضرت امام علی (ع) کے متعلق جو نازیبا الفاظ استعمال کیے ہیں ان کا ترجمہ کرنے کی ہم میں تاب نہیں ہے۔ ابن زیاد کے جملوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ چونکہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے یزید کی بیعت سے انکار کر دیا تھا، لہٰذا وہ خلیفہ وقت یزید اور اس کے ساتھیوں کو اہل حق جبکہ حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے جانثاروں کو (نعوذ باللہ) اہل باطل تصور کرتا تھا۔ جب یزید مر گیا تو عبید اللہ ابن زیاد نے شام کی جانب راہ فرار اختیار کی، راستے میں اس نے اپنے ایک ساتھی کے جواب میں کہا کہ:

”أما قتلی الحسين فانه خرج علی امام وأمة مجتمعة، وكتب الی الامام يأمرنی بقتله، فان كان ذلك خطأ كان لازما ليزيد“

یعنی: ’ جہاں تک قتل حسین کا تعلق ہے۔ انہوں نے امام اور پوری امت کے خلاف بغاوت کی تھی اور مجھے میرے امام نے لکھ بھیجا تھا کہ میں انہیں قتل کردوں۔ اگر یہ اقدام غلط تھا تو اس کا ذمہ دار یزید ہے۔“۔(14)

جب اہل مدینہ نے یزید کی بیعت توڑ دی تو عبداللہ بن عمر نے اپنے بیٹوں اور موالیوں کو جمع کیا اور ایک حدیث کے ذریعے انھیں بیعت پر آمادہ کیا اور کہا: ”تم میں سے کوئی ہرگز یزید کی بیعت نہ توڑے اور کوئی اس امر میں تردد کا شکار نہ ہو ورنہ میرے اور تمھارے درمیان تلوار ہوگی“۔(15)

جب دور یزید میں حصین بن نمیر نے شامی فوجوں کے ساتھ مکہ پر حملہ کیا تو خانہ کعبہ کی طرف آیا اور اس کی طرف آگ پھینکی۔ یہاں تک کہ کعبہ کو جلا دیا۔ اس وقت ابن زبیر کے قاضی عبداللہ بن عمیر لیثی نے شامیوں کو خانہ کعبہ کی بے حرمتی کرنے سے ڈرایا لیکن بعض شامیوں نے کہا کہ :

"ان الحرمة والطاعة اجتمعتا، فغلبت الطاعة الحرمة" (16)

یعنی: "حرمت خدا اور اطاعت (خلیفہ) اکھٹے ہو گئے اور اطاعت حرمت پر غالب آگئی۔"

ان تمام واقعات میں جس مشترکہ بات کا واضح اشارہ ملتا ہے وہ یہ ہے کہ امام حسین علیہ السلام کے مخالفین اپنے خلیفہ کی اطاعت کو واجب سمجھتے تھے اور مخالف گروہ کو باغی گردانتے تھے اور امام جائر اور امام عادل کی اطاعت میں کچھ فرق نہیں کرتے تھے بلکہ شاید امام عادل کی اطاعت میں اس قدر سرگرمی نہ دکھاتے ہوں جیسا کہ تاریخ میں امیر المومنین کے ساتھیوں کا حال ملتا ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کی جن خطوط پر تربیت کی گئی تھی انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ اطاعت امام کا فلسفہ کیا ہے اور یہ کہ امام جائر اور امام عادل میں کیا فرق ہے۔ ان کو یہ بتایا ہی نہیں گیا تھا کہ امام جائر کی مخالفت بھی اسلام کی تعلیمات کا حصہ ہے اور ظلم کے مقابلے میں اُٹھ کھڑا ہونا اور ظالم حکمران کے سامنے کلمہ حق بلند کرنا سب سے بڑا جہاد ہے۔ امام حسین علیہ السلام اسی پیغام کو لے کر آگے بڑھے اور جب ان سے ولید بن عتبہ نے یزید کی بیعت کا مطالبہ کیا گیا تو فرمایا:

"أيها الأمير انا أهل بيت النبوة، ومعدن الرسالة، و مختلف الملائكة، وبنا فتح الله، وبنا يختم، ويزيد رجل فاسق شارب الخمر، قاتل النفس المحترمة، معلن بالفسق ومثلي لا يبايع مثله، ولكن نصبح وتصبحون، وننظر وتنظرون أينا أحق بالبيعة والخلافة۔"

یعنی: "اے امیر! ہم خاندان نبوت اور معدن رسالت ہیں۔ ہمارے گھر پر فرشتوں کی رفت وآمد رہا کرتی ہے، اور ہمارے خاندان پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام ہمارے گھرانے سے شروع کیا اور آخر تک ہمیشہ ہمارا گھرانہ اسلام کے ہمراہ رہے گا۔ لیکن وہ یزید جس کی بیعت کی تم مجھ سے توقع کر رہے ہو، اس کا کردار یہ ہے کہ وہ شراب خوار ہے، بے گناہ افراد کا قاتل ہے، اس نے اللہ تعالیٰ کے احکام کو پامال کیا اور برسر عام فسق و فجور کا مرتکب ہوتا ہے۔ مجھ جیسا شخص کسی صورت اس جیسے شخص کی

بیعت نہیں کرے گا۔ اب ہم اور تم دونوں آنے والے وقت کا انتظار کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ہم میں سے کون خلافت اور بیعت کا زیادہ مستحق ہے۔" (17)

اس فرمان میں حضرت امام حسین علیہ السلام نے پہلے اپنا تعارف کرایا، پھر یزید کا کرایا اور اس کے اعمال قبیحہ کو بیان کرکے کہا کہ مجھ جیسا شخص اس جیسے شخص کی بیعت نہیں کرسکتا اور آخر میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ آنے والے وقت کا انتظار کرو کہ ہم زیادہ مستحق خلافت و بیعت ہیں یا وہ شخص۔ گویا امام حسین علیہ السلام یہ فرمارہے ہیں کہ امت مسلمہ کی قیادت و رہبریت کے لیے کچھ شرائط ہیں اور یہی وہ شرائط ہیں جن کی بناپر امیر کی اطاعت واجب ہے اگر یہ شرائط ختم ہوجائیں یا سرے سے موجود ہی نہ ہو تو پھر اس کی خلافت و ولایت ہی جائز نہیں ہوگی نیز اس کی اطاعت بھی ساقط ہوجائے گی یہاں تک کہ اس کی مخالفت واجب ہوجائے گی۔

روایت میں ہے کہ اس واقعہ کے دوسرے دن کسی مقام پر جب حضرت امام حسین علیہ السلام اور مروان کا آمناسامنا ہوا تو اس نے حضرت امام حسین سے کہا کہ آپ یزید کی بیعت کرلیں، اسی میں آپ کے دین اور دنیا کی بھلائی ہے تو حضرت امام حسینؑ نے فرمایا:

" انا للہ وانا الیہ راجعون وعلی الاسلام السلام اذ قد بلیت الأمة براع مثل یزید ولقد سمعت جدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یقول الخلافة محرمة علی أبی سفیان "

یعنی: " اگر امت کی رہبری یزید جیسے شخص کے ہاتھوں میں ہو تو پھر اسلام پر فاتحہ پڑھ لینا چاہئے، میں نے اپنے جد رسول اکرم سے سنا ہے کہ انہوں نے فرمایا: خلافت خاندان ابوسفیان پر حرام ہے۔" (18)

یعنی مروان کے نزدیک حضرت امام حسینؑ کے لئے دین و دنیا کی بھلائی اس میں تھی کہ وہ یزید کی بیعت کرلیں جبکہ حضرت امام حسینؑ امت کی رہبری کے لئے یزید کے منتخب ہونے اور اس کی بیعت کرنے کو اسلام کی موت تصور کرتے تھے۔ امام حسینؑ نے یہ نہیں فرمایا کہ یزید جیسے حکمران سے مملکت کی سلامتی کو خطرہ ہے یا معیشت کو خطرہ ہے یا ثقافت کو خطرہ ہے بلکہ فرمایا کہ اسلام کو خطرہ ہے یعنی یزید جیسے حکمران آئیڈیالوجی کے لیے خطرہ ہیں اور تاریخ نے ثابت کردیا کہ کس طرح اسلام کی روح ختم کردی گئی۔ یہی کیا کم ہے کہ حاکم جائر کے سامنے کلمہ حق بلند کرنا اسلام میں تو اعلیٰ ترین جہاد ہے لیکن یزیدی فکر میں

بغاوت اور قابل گردن زدنی قرار پاتا ہے اور حسینؑ بن علیؑ جیسے وحی و نبوت کی آغوش میں پرورش پانے والے کو قتل کرنے کے لیے عمر بن سعد، شمر اور ابن زیاد جیسے فاسق و فاجر اطاعت امیر کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔

امام حسین علیہ السلام نے بھی اپنا مشن جاری رکھا اور یزیدی فکر کے مقابلے میں اس فکر کی ترویج کرتے رہے جو انہیں پیغمبر سے وراثت میں ملی تھی۔ جب اہل کوفہ کو یہ خبر ملی کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے بیعت کا مطالبہ مسترد کر دیا ہے اور مکہ تشریف لا چکے ہیں تو انہوں نے بڑی تعداد میں انفرادی اور اجتماعی طور پر خطوط لکھے، ان کے جواب میں حضرت امام حسین علیہ السلام نے اہل کوفہ کو خط لکھا، جس میں رہبر و امام کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"الحاکم بالکتاب القائم بالقسط الدائن بدین الحق الحابس نفسه علی ذلك لله والسلام۔"

یعنی: "امام اور رہبر وہ ہے جو کتاب خدا پر عمل کرے، عدل و انصاف کا راستہ اختیار کرے، حق کی پیروی کرے اور اپنے وجود کو اللہ کے لئے وقف کر دے۔" (19)

یعنی حضرت امام حسین علیہ السلام کے نزدیک اس امت کا اصل حاکم وہ ہے، جس میں مندرجہ بالا صفات پائی جائیں اور اگر یہ صفات نہ ہوں تو وہ اسلامی معاشرے کی قیادت کے لیے اہل ہی نہیں ہوگا پھر اس کی اطاعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ امام حسینؑ نے کوفہ سے کربلا جاتے ہوئے راستے میں شراف کے مقام پر نماز عصر کے بعد حر بن یزید ریاحی کے لشکر سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"أیها الناس انکم ان تتقوا الله و تعرفوا الحق لأهله یکن أرضی لله عنکم ، ونحن أهل بیت محمد صلی الله علیه وآله وسلم أولی بولایة هذا الأمر علیکم من هؤلاء المدعین ما لیس لهم ، والسائرین فیکم بالجور والعدوان۔"

یعنی: "اے لوگوں! اگر خدا سے ڈرو اور حق کو اہل حق کے لئے قبول کرو (تمہارا یہ عمل) اللہ کی خوشنودی کا باعث ہوگا۔ ہم نبی اکرم حضرت محمد ﷺ کے اہل بیتؑ، ولایت اور رہبری کے لئے ان لوگوں (بنی امیہ) سے بہتر ہیں جو اس چیز کے دعوی دار ہیں جس کا انہیں حق نہیں ہے۔ انہوں نے ظلم و ستم اور اللہ کی دشمنی کا راستہ اپنایا ہے۔"۔ (20)

بیضہ کے مقام پر حضرت امام حسین علیہ السلام نے لشکر حر سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

”أیها الناس ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال من رأی سلطانا جائرا مستحلا لحرم الله ناکثا لعهد الله مخالفا لسنة رسول الله صلی الله علیه وسلم یعمل فی عباد الله بالاثم والعدوان فلم یغیر ما علیه بفعل ولا قول کان حقا علی الله أن یدخله مدخله ألا وان هؤلاء قد لزموا طاعة الشیطان وترکوا طاعة الرحمن وأظهروا الفساد وعطلوا الحدود واستأثروا بالفیء وأحلوا حرام الله وحرموا حلاله وأنا أحق من غیری۔“

یعنی: ”اے لوگوں! رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ظالم حاکم کو دیکھے جو اللہ کے حرام کئے ہوئے کو حلال بنارہا ہو، خدا سے کئے گئے عہد و پیمان کو توڑ رہا ہو، رسول کی سنت کا مخالف ہو اور (یہ شخص) ایسے حکام کو دیکھنے کے باوجود اپنے عمل یا اپنے قول سے اس کی مخالفت نہ کرے تو اللہ کو حق ہے کہ اس (خاموش اور بے عمل) شخص کو اسی ظالم کے ساتھ عذاب میں مبتلا کرے۔ اے لوگوں جان لو کہ ان لوگوں (بنی امیہ) نے شیطان کی اطاعت کرلی ہے اور رحمٰن کی اطاعت کو ترک کردیا ہے (خاندان نبوت سے مختص) مال کو اپنے لئے مخصوص کرلیا ہے، اللہ کی طرف سے کئے گئے حرام کو حلال میں اور اللہ کی طرف سے کئے گئے حلال کو حرام میں تبدیل کردیا ہے اور میں (ان مفسدوں کے مقابلے میں اسلامی معاشرے کی رہبری کا) زیادہ حقدار ہوں۔۔۔۔۔۔“۔(21)

اس فرمان میں حضرت امام حسین علیہ السلام نے بالکل واضح الفاظ میں بنوامیہ کی حکومت کی مذمت کی اوران کی بری صفات کا ذکر کرتے ہوئے خود کو اس امت کی رہبری کا اصل حقدار قرار دیا یہی وہ بنیادی نکتہ جس میں بنی امیہ نے تحریف کرکے خود کو اسلامی ریاست کا سربراہ بنالیا تھا اور اگر اس زمانے کا عالم اسلام بلکہ خواص اسلام اس حقیقت کو درک کرلیتے اور اس کے لیے کمر کس لیتے تو اسلامی تاریخ کچھ اور ہوتی اور ایک کے بعد ایک فاسق و فاجر، ظالم و جابر حکمران ظلم و ستم کا بازار گرم نہ کرتے اور دین کو بازیچہ اطفال نہ بنالیتے۔ بدقسمتی سے بنی امیہ نے بعض ایسے درباری علماء بھی جمع کرلیے تھے جو ان کی اس گمراہی کو عین ہدایت قرار دیتے تھے اور عوام کو دین کے نام پر گمراہ کرتے تھے۔ ان کے پاس احادیث بھی تھیں

اور قرآن کی آیات بھی اور وہ ان سے کھیلتے رہتے تھے مثلاً اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم (اللہ کی اطاعت کرو اس کے رسول کی اطاعت کرو اور صاحبان امر کی اطاعت کرو)۔(22)

بنی امیہ نے لوگوں کو سمجھایا کہ اولی الامر سے مراد ہر صاحب حکومت ہے پس لوگوں کو چاہئے کہ وہ ہر حکمران کی اطاعت کریں خواہ وہ ظالم جابر اور فاسق و فاجر ہی کیوں نہ ہوں۔ اس کی مزید توثیق کے لیے کچھ حدیثیں بھی گھڑ لی گئیں اور کہا گیا کہ اس وقت تک اطاعت کرتے رہو جب تک وہ تمہیں نماز تک سے نہ روک دیں مثلاً ذیل کی حدیث پر غور کیجئے:

"قَالَ اِنَّهُ يُسْتَعْمَلُ عَلَيْكُمْ أُمَرَاءُ فَتَعْرِفُونَ وَتُنْكِرُونَ فَمَنْ كَرِهَ فَقَدْ بَرِئَ وَمَنْ أَنْكَرَ فَقَدْ سَلِمَ وَلَكِنْ مَنْ رَضِيَ وَتَابَعَ قَالُوا يَا رَسُولَ اللهِ أَلَا نُقَاتِلُهُمْ قَالَ لَا مَا صَلَّوْا أَيْ مَنْ كَرِهَ بِقَلْبِهِ وَأَنْكَرَ بِقَلْبِهِ۔" (23)

قریب ہے کہ تم پر امیر مقرر ہوں تم ان کے اچھے کام بھی دیکھو گے اور برے کام بھی پھر جو کوئی برے کام کو پہچان لے وہ بری ہوا (اگر اس کو روکے ہاتھ یا زبان یا دل سے) اور جس نے برے کام کو برا جانا وہ بھی بچ گیا لیکن جو راضی ہوا برے کام سے اور پیروی کی اس کی (وہ تباہ ہوا) صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم ایسے امیروں سے لڑائی نہ کریں آپ نے فرمایا نہیں جب تک وہ نماز پڑھا کریں (اور جو نماز بھی چھوڑ دیں تو ان کو مارو اور امارت سے موقوف کر دو) اسی کتاب کے اسی باب کی دوسری حدیث میں ہے کہ لا ما اقاموا فیکم الصلوٰۃ (بغاوت نہ کرو جب تک وہ نماز قائم کرتے رہیں۔

ظاہر ہے کہ جب ظالم حکمران اتنے طاقتور ہو جائیں گے کہ نماز سے بھی گذر جائیں تو پھر ان کے خلاف بغاوت کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے شاید یہی وجہ ہے کہ فاسق ترین مسلمان حکمران بھی نماز جمعہ و عیدین کی امامت کے لیے آجاتے تھے تاکہ اپنی اطاعت کی کم ترین شرط پوری کر دیں۔ یوں بھی اس قسم کے حکمرانوں کو اس سے غرض نہیں کہ لوگ نماز و روزہ کریں یا نہ کریں ان کو تو اپنے اقتدار سے غرض ہوتی ہے جیسا کہ مقاتل الطالبین میں اعمش سے روایت ہے کہ وہ نخیلہ میں امیر شام کے ساتھ تھا کہ خطبہ جمعہ میں اس نے کہا:

"انی واللہ ما قاتلتکم لتصلوا ولا لتصوموا ولا لتحجوا ولا لتزکوا انکم لتفعلون ذلك۔ وانما قاتلتکم لاتأمر علیکم وقد اعطانی اللہ ذلك وانتم کارھون۔"

یعنی: ”قسم بخدا میں نے تم لوگوں سے اس وجہ سے جنگ نہیں کی تھی کہ تم نماز پڑھو اور روزے رکھا کرو، حج ادا کیا کرو اور زکات دیا کرو۔ کیونکہ یہ تو تم کرتے ہی ہو۔ البتہ میں نے تم سے جنگ اس لئے کی کہ تم پر حکومت کروں۔ پس اللہ نے یہ مجھ کو عطا کر دی، حالانکہ تم اس سے ناخوش ہو۔“۔(24)

آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان مفکرین سورہ نساء کی اس آیت کی تفسیر میں سر گرداں ہیں اور ان کے درمیان اس بات میں کافی اختلاف ہے کہ اولی الامر کون ہیں اور کس اولوالامر کی اطاعت واجب ہے اور ایک بڑا گروہ اس سے مراد ہر طرح کے حکمران لیتا ہے اور وہ ان کی اطاعت کو واجب قرار دیتا ہے اور ہر انقلابی تحریک کو بغاوت سمجھتا ہے۔ امام حسینؑ نے اپنے خون سے اس فکر کو باطل قرار دیا اور انقلابی تحریکوں کے لیے راہیں استوار کر گئے یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد عالم اسلام کے تمام بڑے شہروں میں بنی امیہ کے خلاف تحریکیں شروع ہو گئیں جن میں مدینہ میں صحابہ و تابعین کی تحریک جو عبد للہ بن حنظلہ کی قیادت میں چلی اور واقعہ حرہ کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی، مکہ میں عبد اللہ بن زبیر نے بغاوت کر دی، کوفہ میں پہلے حضرت سلیمان بن صرد خزاعی کی قیادت میں توابین اور بعد ازاں مختار ثقفی نے قیام کیا۔

اس کے بعد بھی حضرت زید بن علی بن حسین (زید شہید)، نفس ذکیہ، عبداللہ افطح وغیرہ نے مسلسل تحریکیں چلا کر بنی امیہ اور بنی عباس کے حکمرانوں کی نیندیں حرام کر دیں۔ یہ سب کچھ فکر حسین کا ہی اثر تھا ورنہ کربلا سے پہلے لوگ ہر حکمران کو مقدس سمجھتے تھے اور ان کے خلاف کسی بھی تحریک کا ساتھ دیتے ہوئے گھبراتے تھے۔ عام مسلمان بھی اپنے دین کو حکمرانوں سے لینے کے بجائے فقہاء سے لینا پسند کرتے تھے اور فقہاء نے بھی حکمرانوں کی غلط بات کو ماننے سے انکار کیا جس کے سبب ان کو قید و بند کی صعوبتوں سے گذرنا پڑا اور کوڑے تک کھانے پڑے۔ آج بھی اگر عالم اسلام میں ظالم حکمرانوں کے خلاف بغاوت نظر آرہی ہے تو وہ فکر کربلا ہی کی رہین منت ہے ورنہ تو درباری ملاؤں نے تو ہمیشہ ظالم کی اطاعت کو قرآن و سنت کی روح کے عین مطابق قرار دیا ہے۔

*****

حوالہ جات

1۔ مسلم بن الحجاج أبو الحسن القشیری النیشاپوری، صحیح مسلم، المحقق: محمد فؤاد عبد الباقی، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، بَابُ الْأَمْرِ بِلُزُومِ الْجَمَاعَةِ عِنْدَ ظُهُورِ الْفِتَنِ وتحذیر الدعاة الی الکفر، جز۳، ص۱۴۷۶

2۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، المحقق: محمد زہیر بن ناصر الناصر، دار طوق النجاۃ، الطبعۃ: الأولی، ۱۴۲۲ھ، بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ(ص): سَتَرَوْنَ بَعْدِي أُمُورًا تُنْكِرُونَهَا، جز۹، ص۴۷

3۔ النیشاپوری، صحیح مسلم، ص۱۴۷۸

4۔ ابن الأثیر، عزالدین، الکامل فی التاریخ، تحقیق: عمر عبد السلام تدمری، دار الکتاب العربی، بیروت، لبنان، الطبعۃ: الأولی، ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۷ء، جز۳، ص۱۳۴

5۔ ایضاً، جز۳، ص۱۴۴، ۱۴۵

6۔ محمد بن جریر الطبری، الطبری، تاریخ الأمم والملوک، دار الکتب العلمیۃ بیروت، لبنان، الطبعۃ الأولی، ۱۴۰۷ھ، جز۳، ص۳۰۹

7۔ ایضاً، جز۳، ص۳۰۹۸

8۔ ایضاً، جز۳، ص۳۲۳

9۔ ایضاً، جز۳، ص۳۲۴

10۔ ایضاً، جز۳، ص۳۲۴

11۔ ذہبی، محمد بن أحمد بن عثمان بن قَایْماز، میزان الاعتدال فی نقد الرجال، تحقیق: علی محمد البجاوی، دار المعرفۃ للطباعۃ والنشر، بیروت، لبنان، الطبعۃ: الأولی، ۱۳۸۲ھ، ۱۹۶۳ء، جز۲، ص۲۸۰

12۔ ابن عساکر، أبو القاسم علی بن الحسن بن ہبۃ اللہ، تاریخ دمشق، المحقق: عمرو بن غرامۃ العمروی، دار الفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع، بیروت، لبنان ۱۴۱۵ھ، ۱۹۹۵ء، جز۲۳، ص۱۸۹

13۔ الطبری، تاریخ الأمم والملوک، ص۳۳۷

14۔ دینوری، الأخبار الطوال، تحقیق: عبد المنعم عامر، مراجعۃ: الدکتور جمال الدین الشیال، الأولی، ۱۹۶۰ء، دار احیاء الکتب العربی، عیسی البابی الحلبی وشرکاہ، منشورات شریف الرضی، الطبعۃ الأولی ۱۹۶۰ء القاہرۃ، ص۲۸۴

15۔ بخاری، صحیح بخاری، ص۲۶۰۳

16۔یعقوبی، أحمد بن أبی یعقوب بن جعفر بن وہب ابن واضح الکاتب العباسی، تاریخ الیعقوبی، مؤسسۃ نشر فرہنگ اہل بیت (ع) قم، ایران، ج۲، ص۲۵۲

17۔بحرانی، الشیخ عبد اللہ، العوالم، الامام الحسین (ع)، مدرسۃ الامام المہدی (ع)، الأولی المحققۃ، ۱۴۰۷ھ، مدرسۃ الامام المہدی (عج) بالحوزۃ العلمیۃ، قم، ایران، ص۱۷۴

18۔ابن طاووس، السید، اللہوف فی قتلی الطفوف، الأولی، ۱۴۱۷ھ، مہر، أنوار الہدی، قم، ایران، ص۱۸

19۔ محسن الأمین، السید، اعیان الشیعۃ، ۱۳۷۱ھ، تحقیق و تخریج: حسن الأمین، دار التعارف للمطبوعات، بیروت، لبنان، ج۱، ص۵۸۹

20۔ طبرسی، الشیخ، اعلام الوری بأعلام الہدی، مؤسسۃ آل البیت (ع) لاحیاء التراث، الأولی، ربیع الأول ۱۴۱۷ھ، قم، ایران، ج۱، ص۴۴۸

21۔ابن الأثیر، الکامل فی التاریخ، ص۴۸

22۔القرآن، النساء، آیت۔۵۹

23۔النیشاپوری، صحیح مسلم، ص۱۴۸۰

24۔اصفہانی، ابوالفرج، مقاتل الطالبیین، الطبعۃ الثالثۃ، المنشورات المکتبۃ الحیدریۃ و مطبعہا، ۱۹۶۵ء، النجف الاشرف، ص۴۶، ۴۵

امام حسین علیہ السلام کے اخلاقی محاسن

سید حسنین عباس گردیزی*
hasnain.gardezi@gmail.com

خلاصہ

امام حسین (ع) کی حیات طیبہ کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ابتدائی دور رسول اللہ (ص) کی زیر تربیت گزرا، دوسرا دور اپنے والد گرامی کے زیر سایہ گزارا اور تیسرا دور آپ کے بھائی اور آپ کی اپنی امامت کا زمانہ ہے۔ آخری دور انتہائی مختصر لیکن انتہائی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اس دور میں آپ کی زندگی کا اہم ترین واقعہ کربلا رونما ہوا۔ کربلا کا عظیم واقعہ امام حسین (ع) کی عظمت اور بلندی کردار کا پتہ دیتا ہے۔ امام (ع) کا حسب و نسب بلند و اعلیٰ ہے اور ان کی خاندانی خصوصیات کی نظیر کسی دوسرے انسان میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ اسی وجہ سے آپ کے اخلاق و اوصاف میں بلندی نظر آتی ہے۔ آپ کے مکارم اخلاق درجہ کمال پر تھے۔ سخاوت و کرم امام (ع) کی اہم ترین صفات میں سے ایک ہے اور یہ صفت انہیں اپنے جد رسول اکرم (ص) سے ورثے میں ملی تھی۔ اس حوالے سے چند واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ عطا و بخشش کے ساتھ آپ نے لوگوں کی عزت نفس کا خیال رکھا اور ان کی اسلامی اصولوں پر تربیت بھی فرمائی۔ صبر و استقامت میں امام عالی مقام اپنی مثال آپ ہیں، آپ کا صبر دنیا میں ضرب المثل بن گیا ہے، آپ کے صبر و استقامت، عزم و ارادے اور دلیرانہ جنگ پر فرشتے حیرت میں پڑ گئے۔

امام حسین (ع) میں حلم و بُردباری بھی اعلیٰ درجے کی تھی، غلاموں کی غلطیوں سے چشم پوشی کے ساتھ انہیں آزاد کر دینا آپ کا شیوہ تھا۔ دشمنوں کی گستاخیوں کا جواب نہایت نرمی اور ملائمت کے ساتھ دینا آپ کی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ہے۔ تواضع و انکساری، اولیاء الٰہی کی بنیادی صفات میں سے ہے، امام حسین (ع) کی تواضع کی کئی مثالیں اس مقالے میں نقل ہوئی ہیں۔ امام حسین (ع) کی شجاعت و بہادری انتہا درجے کی تھی جس بہادری کا مظاہرہ آپ نے کربلا کے میدان میں کیا اس کی بنی نوع انسان میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ امام (ع) نے موت اور زندگی کے فلسفہ کو واضح کر دیا۔ تاریخ شاید ہے کہ حسین (ع) غمزدہ، دِل شکستہ، تشنہ و گرسنہ اور بیٹوں، بھائیوں اور یار وانصار کی شہادت کے صدمے برداشت کرنے کے باوجود جب تن تنہا تلوار کھینچ کر یزیدی لشکر پر حملہ آور ہوئے تو تمام گزشتہ بہادروں کے کارنامے محو ہو گئے اور انسانی حافظ میں قیامت تک اس شجاعت و جرأت کی تصویر محفوظ رہ گئی ہے۔

---

*۔ چیئرمین نور الہدیٰ ٹرسٹ، مدرس جامعۃ الرضا و مدیر اعلیٰ مجلّہ نور معرفت "نمت" بارہ کہو اسلام آباد۔

امام حسین علیہ السلام نے اپنی حیات طیبہ کے ابتدائی چھ سال اپنے جد بزرگوار جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آغوش رحمت میں گزارے۔ یہ نزول وحی کا زمانہ تھا، قرآن کی آیات احکام الٰہی کو لے کر آنحضور (ص) کے قلب مقدس پر نازل ہوتیں جنہیں آپؐ اپنی زبان مبارک سے تلاوت کرتی تھی۔ بعض روایات میں ملتا ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی ولادت کے بعد جناب زہرا سلام اللہ علیہا کا دودھ خشک تھا۔ لہٰذا جب امام (ع) کو بھوک لگتی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی زبان مبارک ان کے منہ میں دے دیتے تھے۔ یا اپنی انگشت مبارک دہن میں دے دیئے تھے اور وہ سیراب ہو جاتے۔ (1)

وحی الٰہی اور اپنے جد امجد کی محبت و شفقت اور بے پناہ پیار کے سایے میں آپ کا یہ دور گزرا۔ آپ (ع) کی زندگی کا دوسرا دور جو تیس سال پر محیط ہے، آپ کے والد بزرگوار جناب امیر المومنین علی ابن ابی طالب (ع) کے ساتھ گزرا۔ اس دوران آپ کے خاندان پر عظیم مصائب ٹوٹے امام نے اپنے بابا کی تنہائی کا مشاہدہ بھی کیا اور اپنی اماں پر مظالم کو بھی دیکھا اور پھر ماں کی جانکاہ شہادت کا صدمہ بھی سہا اور آخر میں اپنے باپ کی عادلانہ حکومت کے مختصر ایام بھی ملاحظہ کیے۔

آپ کی زندگی کا تیسرا دور اپنے بڑے بھائی امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی امامت میں گزرا اس میں امامؑ نے اپنے بھائی کے سب سے بڑے اقدام صلح پر ان کی حمایت کی اور صلح کے بعد باقی دس دسال کا عرصہ ان کی اطاعت میں گزرا۔ امام حسن علیہ السلام کی شہادت کے بعد آپ نے اپنی امامت کے دس سال معاویہ بن سفیان کی حکومت میں بسر کیے یہ دور معاویہ کے ظاہری اقتدار کا اوج قدرت اور کمال تسلط کا دور تھا۔ اس میں آپ نے مسلسل معاویہ کی بدعتوں اور اس کے عُمّال کے ناجائز کاموں کے خلاف اپنا رد عمل ظاہر کیا، اور ان پر تنقید و اعتراض بھی کیا چند موارد تاریخ کی کتب میں ثبت ہیں، ان میں سے ایک واقعہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ ابن قتیبہ دینوری اپنی کتاب "الامامۃ والسیاسۃ" میں بیان کرتے ہیں:

معاویہ نے یزید کی ولی عہدی کو مضبوط کرنے کے لیے مدینے کا سفر اختیار کیا تاکہ مدینے کے لوگوں خصوصاً اس کے شہر کی برجستہ شخصیات جن میں سر فہرست امام حسین علیہ السلام تھے سے بیعت لے۔

مدینے میں وارد ہونے کے بعد اس نے امام حسین علیہ السلام اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملاقات کی اور دوران گفتگو یزید کی ولی عہدی کے مسئلہ کو پیش کیا اس نے اس موضوع پر امام کو موافق

کرنے کی بڑی کوشش کی۔ امام حسین علیہ السلام نے اس کی باتوں کا جواب ایک مقدمے کو ذکر کرنے کے بعد یوں دیا:

تو بزعم خود اپنی جس برتری اور فضیلت کا قائل ہے اس میں تو لغزش اور افراط کا شکار ہوا ہے اور اموال عمومی پر قبضہ کرکے ظلم وستم کا مرتکب ہوا ہے، تو نے لوگوں کے اموال کو ان کے مالکوں کو واپس کرنے میں بخل سے کام لیا ہے اور اس قدر آزادی کے ساتھ غارت گری کو اپنایا کہ اپنی حدود سے تجاوز کیا اور حق داروں کو ان کے حقوق ادا نہ کیے یوں شیطان نے اپنا بھرپور فائدہ اٹھایا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔

تو نے جو کچھ یزید کے کمالات اور امت اسلامی کے امور کو چلانے کے لیے اس کی صلاحیتوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ سب کچھ میں سمجھتا ہوں۔ تو نے یزید کا تعارف اس انداز سے کرایا ہے گویا اس کا کردار اور زندگی گزارنے کا طریقہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہے! یا تم غیبی خبر دے رہے ہو جس کا لوگوں کو علم نہیں ہے! اور صرف تجھے اس کی اطلاع ہے! نہیں ! یزید نے جس طرح خود اپنے آپ کو ثابت کیا ہے اور اپنے باطن کو آشکار کیا ہے اسی طرح اس کا تعارف کرا، جیسا وہ ہے ویسی اس کی تعریف و توصیف بیان کر۔ یزید کتوں، کبوتروں سے کھیلنے والا ایک لاابالی جوان ہے۔ جس نے اپنی عمر ساز و آواز اور عیش عشرت میں گزاری ہے۔

یزید کا تعارف یوں بیان کرو اور اس بے فائدہ کوشش سے دستبردار ہو جاؤ اس امت کے حوالے سے جتنے گناہوں کا بوجھ اب تک اٹھا چکے ہو وہی کافی ہے۔ ایسا کام نہ کرو جس کی بنا پر اپنے پروردگار سے ملاقات کے وقت تیرے گناہوں کا وزن اور بھاری ہو جائے۔ تو نے اس قدر اپنی باطل اور ظالمانہ روش جاری رکھی اور اپنی بے عقلی سے اتنے مظالم کا ارتکاب کیا کہ اب لوگوں کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا ہے۔ اب تیرے اور تیری موت کے درمیان چشم زدن سے زیادہ بفاصلہ نہیں رہا ہے۔ جان لو کہ تمہارے اعمال پروردگار عالم کے پاس محفوظ ہیں اور تجھے قیامت کے دن ان کا جوابدہ ہونا پڑے گا۔ (2)

امام حسین علیہ السلام کی زندگی کے آخری دور کا آغاز رجب ۶۰ ھجری سے ہوا ہے اور اس کا اختتام محرم ۶۱ ھجری میں عاشورہ کے دِن ہوا ہے۔ اس دور میں آپ کی زندگی کا اہم ترین ''واقعہ کربلا'' رونما ہوا۔ یہی ایک واقعہ آپ کی پوری زندگی پر حاوی ہو گیا۔ تاریخ انسانی میں بڑے بڑے واقعات اور انقلابات پیش

آئے مگر واقعہ کربلا کی عظمت ان سب سے بڑھ کر ہے۔ عرب کے ایک فلسفی شاعر نے کہا ہے: ''اِنَّ العظائم کفوالعظمآء ''یعنی : '' بے شک بڑے کارناموں کے لیے بڑی شخصیات ہی درکار ہوتی ہیں۔'' ایک اور شاعر نے اسی مطلب کو اس طرح بیان کیا ہے:

علی قدر اھل العزم تأتی العزائم　　وتاتی علی قدر الکرام المکارم

ویکبرفی عین الصغیر صغارھا　　وتصغرفی عین العظیم العظائم (3)

یعنی: ''عزم و ارادے کے حامل افراد کی شخصیات کے مطابق ان کے عزائم ہوتے ہیں اور اعلیٰ مرتبہ ہستیوں کی مناسبت سے ہی ان کی بزرگیاں ہوتی ہیں۔ چھوٹے آدمی کی نگاہ میں چھوٹا سا کام بھی بڑا معلوم ہوتا ہے اور بڑے کی نگاہ میں بڑا کام بھی چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔''

اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو کربلا جیسے عظیم الشان کارنامے کا حامل ہونا ہی امام حسین علیہ السلام کی شخصیت کی عظمت اور ان کے کرادر کی بلندی پر واضح ثبوت پیش کر دیتا ہے جس کا شاید پورے طور پر اندازہ کرنا اور پھر اُسے واضح طور پر الفاظ کے ذریعے بیان کرنا مورخین کے تصور اور تحریر کی قوت سے باہر ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ واقعہ کربلا کی نادر خصوصیات وقوع پذیر نہیں ہو سکتی تھیں اگر اس کے انجام دینے کے لیے حسین علیہ السلام جیسے بلند نفس کا انسان موجود نہ ہوتا۔ اور واقعہ کربلا میں عظمت، اہمیت اور نتیجہ کے لحاظ سے یہ تاثیر پیدا ہو ہی نہیں سکتی تھی اگر اس کا تعلق امام حسین علیہ السلام جیسی عظیم المرتبت ذات کے ساتھ نہ ہوتا۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کی خاندانی خصوصیات کی نظیر کسی دوسرے انسان میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ آپ کا نانا تمام انبیاء ورسل کا سردار، والد گرامی تمام اوصیاء کے سردار اور ماں عالمین کی عورتوں کی سردار تھیں۔ ان خاندانی خصوصیات کے ساتھ جو ظاہری اسباب کی بناپر حسن فطرت کے ضامن ہیں حسین علیہ السلام نے تربیت ایسی بلند پائی تھی جس سے انسان کے اخلاق و اوصاف میں بلندی پیدا ہونا لازمی ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کے مکارم اخلاق درجہ کمال پر تھے، یہاں پر ان میں سے چند محاسن کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

جود و کرم

امام حسینع لیہ السلام انتہائی فیاض اور خلق خدا کو فائدہ پہنچانے کی فکر میں رہتے تھے۔ اس کے واقعات تاریخ میں بکثرت ملتے ہیں: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: حسین علیہ السلام میں میری بہادری اور سخاوت ہے" سخاوت آپ کو اپنے نانا سے ورثے میں ملی تھی۔ یوں توامام حسین علیہ السلام رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام اوصاف کے وراث تھے لیکن خصوصیت کے ساتھ سخاوت اور شجاعت بخشنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے یہ اوصاف ضرور امتیاز رکھتے ہیں۔

کتاب عقد اللئالی فی مناقب الال میں منقول ہے کہ امام حسین علیہ السلام اپنے بھائی حسن علیہ السلام کی شہادت کے بعد مسجد نبوی کے ایک گوشے میں تشریف فرما تھے، عبد اللہ بن زبیر اور عتبہ بن ابی سفیان ایک دوسرے کونے میں بیٹھے ہوئے تھے اسی دوران اونٹنی پر سوار ایک اعرابی آیا اس نے اونٹنی کو مسجد کے دروازے پر باندھااور مسجد میں داخل ہوا، عتبہ کے پاس آکر کھڑا ہوا، اُسے سلام کیا، اس نے سلام کا جواب دیا۔ اعرابی نے اس سے کہا میں نے اپنے چچازاد کو قتل کیا ہے اس کے گھر والے مجھ سے دیت کا تقاضا کر رہے ہیں کیا تم مجھے کچھ عطا کر سکتے ہو؟ عتبہ نے اپنے غلام کو اُسے سو درہم دینے کا حکم دیا، اس کے بعد اعرابی عبد اللہ بن زبیر کے پاس گیا اور اپنی بات کو دہرایا اس نے دو سو درہم دینے کا حکم دیا، اعرابی نے انہیں پھینکتے ہوئے کہا یہ مقدار تو میری کسی مشکل کو حل نہیں کرتی۔

پھر وہ امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا، سلام پیش کیا اور اپنی حاجت بیان کی، امام حسین علیہ السلام نے اس سے مخاطب ہوئے اور فرمایا: ہم وہ افراد ہیں جو عطا و بخشش، معرفت کے حساب سے کرتے ہیں۔ اُس نے کہاآپ جو چاہیں پوچھیں امام (ع) نے پوچھا:

" یا اعرابی! ما النجاۃ من الھلکۃ؟ قال: التوکل علی اللہ، فقال لہ: ای الاعمال افضل؟ فقال: الثقۃ باللہ، فقال الامام علیہ السلام: ای شی خیر للعبد فی حیاتہ؟ قال: علم معہ حلم، قال: فان خانہ ذلک؟ قال: مال یزینہ سخاء و سعۃ۔ قال: فان اخطأہ ذلک؟ قال: الموت و الفناء خیر لہ الحیاۃ و البقائ۔"

یعنی: "اے اعرابی! ہلاکت سے نجات کا راستہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا: خدا پر توکل آپ (ع) نے پوچھا: کون سا عمل افضل ہے۔ اس نے کہا: اللہ تعالیٰ پر اعتماد اور بھروسہ امام علیہ السلام نے تیسرا سوال کیا، انسان کی زندگی میں کون سا عمل بہتر ہے؟ اس نے جواب میں کہا: علم جو حلم و بردباری کے ساتھ ہو۔ امام (ع) نے

فرمایا اگر یہ اس کے پاس نہ ہو تو پھر؟ اعرابی نے کہا: مال جو سخاوت کے ساتھ مزین ہو، امام (ع) نے فرمایا: اگر یہ بھی اُسے حاصل نہ ہو؟ تو اس نے کہا پھر اس کے لیے زندگی سے بہتر موت ہے۔"

امام (ع) نے تعجب کیا اور اپنے منشی سے کہا کہ اسے بیس ہزار درہم دے دو، دس ہزار تمہاری ادائیگی کے لیے اور باقی دس ہزار تمہاری مشکلات دور کرنے اور اپنے اہل وعیال کی ضروریات پورا کرنے کے لیے ہیں۔ اس کے بعد اعرابی نے یہ اشعار پڑھے۔"

سبقت الانام الی المکرمات　　وانت الجواد فلا تلحق

ابوک الذی ساد بالمکرمات　　فقصر عن سبقہ السبق

بہ فتح اللہ باب الرشاد　　وباب العناد بکم مغلق (4)

یعنی: "نیک کاموں میں آپ نے سب لوگوں پر سبقت لی ہے، آپ سخی ہیں اور کوئی آپ کی عظمت تک نہیں پہنچ سکتا، آپ کے والد گرامی وہ ہیں جو اپنے نیک کارناموں کی وجہ سے سردار ہوگئے۔ سبقت لینے والے ان سے پیچھے رہ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ ہدایت کا دروازہ کھولا اور گمراہی اور فساد کا دروازہ بند کیا۔"

ایک اور روایت میں یوں نقل ہوا ہے کہ امام (ع) نے اُسے ہزار دینار کی تھیلی عطا کی اور ایک انگوٹھی جس کی قیمت دو سو درہم تھی عطا کی۔ اعرابی نے اُسے لیا اور اس آیت کو تلاوت کیا۔ (5)

"اَللّٰہُ أَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ" (انعام۔ ۱۲۴)

یعنی: " اللہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کو کہاں قرار دے"

اس واقعے میں خدمت خلق اور نوع انسانی کی ہمدردی کے بہترین جذبے کے ساتھ ساتھ آپ نے اس کی بھی تلقین فرمائی ہے کہ اس میں حفظ مراتب کا خیال رکھنا چاہیے۔ یعنی سائل جتنا صفات کے اعتبار سے قابل عزت ہو اور علم ومعرفت میں بلند درجہ رکھتا ہو اتنا اس کے ساتھ سلوک بہتر کیا جائے۔ یہ طرز عمل غرباء اور مساکین کو مذہبی معلومات حاصل کرنے کا بہترین محرک تھا اور اس کے ذریعے سے عوام میں علوم ومعارف کی اشاعت ہوتی تھی۔ تاریخ ابن عساکر میں بیان ہوا ہے کہ ایک سائل مدینے کی گلیوں میں پھرتا ہوا امام حسین علیہ السلام کے دروازے پر پہنچا اور دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد یہ اشعار پڑھنے لگا۔

لم یخب الان من رجاك ومن　　حرك من خلف بابك الحلقة

انت ذو الجود وانت معتمد　　ابوك قد کان قاتل الفسقة

یعنی: " جس نے آپ سے امید باندھی وہ کبھی مایوس نہیں ہوا اور جس نے آپ کا دروازہ کھٹکھٹایا وہ خالی ہاتھ نہیں لوٹا، آپ جود و سخا کے مالک اور قابل بھروسہ ہیں اور آپ کے والد فاسقین کی گردنیں اڑانے والے تھے۔"

امام حسین علیہ السلام نماز میں مشغول تھے، آپ نے جلدی سے نماز ختم کی اور اعرابی کے پاس آگئے آپ نے اس کے چہرے پر سختی اور فقر کے اثرات مشاہدہ کیے۔ امام (ع) نے اپنے منشی کو بلایا اور پوچھا کہ ہمارے اخراجات کے لیے کتنی رقم موجود ہے؟ اس نے کہا: مولا دو سو درہم، جن کے بارے میں آپ نے حکم دیا ہے کہ آپ کے اہل وعیال کے اخراجات پورے کروں۔ آپ نے فرمایا: انہیں لے آؤ کیونکہ کوئی آیا ہے جو ہم سے زیادہ ان پیسوں کا حقدار ہے۔ امام (ع) نے اس سے درہم لے کر اس اعرابی کے حوالے کر دیئے اور پھر یہ اشعار پڑھے۔

خذها وانی الیك معتذر　　واعلم بانی علیك ذو شفقة

لوکان فی سیرنا الغداة عصا　　امست سمانا علیك مندفقه

لکن ریب الزمان ذو غیر　　والکف منا قلیلة النفقه (6)

یعنی: " اے اعرابی! لے لو اسے، میں تجھ سے عذر خواہی کرتا ہوں اس لیے کہ تیرا حق مجھ سے ادا نہ ہوا، یقین کرو میں تیرے حال پر بہت مہربان ہوں اگر آج ہمارے لیے کچھ حکومت ہوتی اور ہمارا حق غصب نہ ہوتا تو دیکھتا کہ ہمارا ابر کرم تجھ پر کیسے برستا، لیکن کیا کریں گردش زمان نے ہمارے امور متغیر کر دیئے ہیں اور ہمارا ہاتھ ان دنوں میں تنگ ہے۔' اعرابی نے حضرت سے رقم لی اور رونے لگا، فرمایا: کیا تو اس لیے روتا ہے کہ یہ رقم تھوڑی ہے، عرض کیا اے آقا میں اس لیے روتا ہوں کہ ایسے سخی ہاتھ کیسے خاک میں پنہاں ہو جائیں گے۔"

اعرابی نے وہ رقم پکڑی اور کہا:

مطهرون نقیات ثیابهم　　تجری الصلاة علیهم اینما ذکروا

انصار مدینہ میں سے ایک شخص امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا میری ایک حاجت ہے۔ آپؑ نے فرمایا: اے انصاری برادر! اپنے چہرے کو سوال او مانگنے کی ذلت سے بچا اور اپنی ضرورت کو

تحریری صورت میں بیان کرو، میں تمہاری حاجت کو پورا کروں تاکہ تم خوش ہو جاؤ۔انصاری نے لکھا کہ فلاں شخص کا میں پانچ سو دینار کا مقروض ہوں اور وہ مجھ سے قرض کی واپسی کا تقاضا کر رہا ہے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس سے بات کریں تاکہ وہ مجھے کچھ مہلت دے دے۔

آپ نے تحریر کا مطالعہ کیا اور گھر تشریف لے گئے ، آپ نے تھیلی اُسے دی جس میں ہزار دینار تھے، فرمایا: پانچ سو دینار سے اپنا قرض ادا کرو اور باقی تمہاری دیگر ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہیں۔ اور اس سے فرمایا: تین قسم کے افراد کے علاوہ کبھی کسی سے حاجت طلب نہ کرنا۔دین دار شخص سے یا عالی المترتبت اور صاحب مروت آدمی سے یا پھر عالی النسب فرد سے طلب کرنا، کیونکہ متدین شخص تیری حاجت کو پورا کرنے کے ذریعے اپنے دین کو بچائے گا، صاحب مروت آدمی اپنے عزت کی خاطر تیری حاجت پورا کرے گا اور حسب ونسب کا حامل شخص جانتا ہے کہ تو نے اپنی عزت داؤپر لگائی ہے اس لیے وہ خالی نہیں لوٹائے گا اور تیری حاجت پوری کرے گا۔ (7)

صبر واستقامت

صبر یہ ہے کہ انسان سخت ترین حالات میں اپنے اعصاب پر قابو رکھے اس میں کوئی شک نہیں کہ عاشورہ کے دن جن مشکل ترین اور سخت ترین حالات سے امامؑ گزرے میں شاید ہی کوئی انسان اس کی تاب لاسکے لیکن امامؑ نے ان سب حالات پر صبر کیا اس طرح سے کہ ان کے صبر واستقامت، آہنی عزم وارادے اور دلیرانہ جنگ پر فرشتے حیرت میں پڑ گئے۔

حضرت مہدی علیہ السلام زیارت ناحیہ میں فرماتے ہیں:

"قد عجبت من صبرك ملائكة السماوات، فاحدقوابك من كل الجهات، واثخنوك بالجراح، واحالوا بينك وبين الرواح، ولم يبق لك ناصرٌ وانت محستب صابر تذب عن نسوتك واولادك حتى نكسوك عن جوادك"

یعنی: "(آپ نے تمام مصائب اور سختیوں کو برداشت کیا) یہاتنک کہ آسمان کے ملائکہ آپ کے صبر پر حیرت زدہ ہو گئے، دشمنوں نے ہر طرف سے آپ کو اپنے محاصرے میں لے لیا اور زخموں سے چور ہو کر آپ گر گئے اور آپ کا کوئی مددگار باقی نہ رہا تھا۔ آپ نے صبر کیا اور اپنی عورتوں اور اپنی اولاد کا دفاع کیا۔" (8)

جب آپ زخموں سے نڈھال ہو کر زمین پر گرگئے اور تمام تر مصائب و آلام کے باوجود نہ آپ نے آہ بھری اور نہ آنکھوں سے آنسو بہایا بلکہ مسلسل یہی فرمارہے تھے۔

"صبراً علی قضاءِكَ، لا معبودَ سِوَاكَ یا غیاث المُسْتَغِیثِیْنَ"

یعنی: "تیری قضاپر راضی اور صبر کرتا ہوں، اے فریادرسوں کے فریادرس تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔"

آخر میں فرمایا:

"صبرا علی قضائِكَ یا ربِّ، لا اِلهَ سِواك۔ یا غیاث المُسْتَغِیثِیْن، مالی رَبٌّ سِوَاك ولا معبُودَ غیرُك، صبرًا علیٰ حُكْمِكَ، یا غیاثَ مَنْ لا غیاثَ لَهُ، یا دائماً لا نفادَلَهُ یا محییَ الموتیٰ، یا قائماً عَلیٰ كُلِّ نفسٍ بما كَسَبَتْ۔ اُحْكُمْ بَیْنِي وَبَیْنَهُم وَاَنْتَ خَیْرُالحاكمین"

یعنی: " تیرے فیصلے پر صبر کرتا ہوں اے میرت رب، تیرے سوا کوئی معبود نہیں، اے پناہ طلب کرنے والوں کی پناہ، اے خدا تیرے سوا میرا کوئی پروردگار نہیں ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، تیرے حکم پر صبر کرتا ہوں، اے پناہ جس کی کوئی پناہ نہ ہو، اے ہمیشہ باقی رہنے والے، اے مردوں کو زندہ کرنے والے، اے وہ جو ہر شخص کے عمل کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ میرے اور میرے دشمنوں کے درمیان فیصلہ فرما: کراے بہترین فیصلہ کرنے والے۔"(9)

حلم وبردباری

امام (ع) کے ایک غلام نے اسے ایک خطا سرزد ہوئی جس پر سزا لازمی تھی امام (ع) نے حکم دیا کہ اُسے سزا دی جائے اس نے عرض کیا میرے آقا: 'والکاظمین الغیظ ' (اور جو اپنے غصے کو پی جانے والے ہیں) امام (ع) نے فرمایا: اِسے چھوڑ دو، اس نے کہا "والعافین عن الناس" (وہ لوگوں سے در گزر کرنے والے ہیں) امام نے فرمایا: میں نے تجھے معاف کیا۔اس نے کہا "وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ " (آل عمران، ۱۳۴) (اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔) امام (ع) نے فرمایا: (میں نے تجھے راہ خدا آزاد کر دیا اور پہلے سے دوگنا معاوضہ بھی تمہیں دیا کروں گا)(10)

عصام بن مصطلق بیان کرتا ہے کہ مدینے میں داخل ہوا، میرا سامنا حسین بن علی علیہما السلام سے ہو گیا، جب میری نظران پر پڑی تو ان کے والد علی علیہ السلام کے بارے میں میرے دل میں جو بغض وکینہ تھا اس نے

مجھے مجبور کیا کہ امام حسین علیہ السلام کو ناسزا کہوں اور اپنے بغض و کینہ کو ظاہر کروں، میں ان کے نزدیک گیا اور کہا کہ ابو تراب کے بیٹے تم ہو! امام نے اثبات میں جواب دیا، میں نے انہیں اور ان کے باپ کو خوب برا بھلا کہا۔ لیکن امام (ع) نے لطف و مہربانی سے میری طرف دیکھا اور فرمایا:

"اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، بسم اللہ الرحمن الرحیم خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ O وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ" (سورہ اعراف ۱۹۹۔ ۲۰۲)

یعنی: " (اے رسول) درگزر سے کام لیں، نیک کاموں کا حکم دیں اور جاہلوں سے کنارہ کش ہو جائیں، اور اگر شیطان آپ کو اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگیں، یقیناً وہ بڑا سننے والا جاننے والا ہے۔"

یہ آیات اعلیٰ انسانی صفات کو بیان کر رہی ہیں جن کے مخاطب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

اس کے بعد امام (ع) نے فرمایا: 'اخفض علیك، استغفر اللہ لی ولك" آرام سے رہو میں تمہارے لیے اور اپنے لیے اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہوں۔ اگر تمہیں ہماری مدد کی ضرورت ہو تو میں تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں، اگر تمہیں پیسوں کی ضرورت ہے تو وہ تمہیں دیتا ہوں اور اگر ہدایت اور راہنمائی چاہتے ہو تو تمہاری راہنمائی اور ہدایت کے لیے آمادہ ہوں۔

عصام کہتا ہے میں اپنی باتوں اور اپنی غلطی پر سخت نادم اور پشیمان ہوا، امام نے اپنی فہم و فراست سے میری شرمندگی کو سمجھ لیا اور فرمایا:

"قَالَ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ"

یعنی: "یوسف سے کہا: آج تم پر کوئی عتاب نہیں ہو گا، اللہ تمہیں معاف کر دے گا اور وہ سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔" (یوسف، ۹۲)

یہ آیت حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی جب انہوں نے ان سے معافی طلب کی تھی۔

پھر انہوں نے پوچھا: تم اہل شام ہو؟ میں نے کہا: ہاں تو انہوں نے یہ ضرب المثل فرمائی: "شنشنة اعرفها من اخزم "جس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں برا بھلا کہنا اہل شام کی رسم اور عادت بن گئی ہے جسے امیر شام نے ان کے درمیان رائج کیا ہے۔ پھر فرمایا: تمہیں کوئی بھی حاجت ہو کھلے دِل سے ہم سے مانگو تاکہ

اُسے پورا کروں۔ عصام کہتا ہے: میری تمام تر گستاخی اور جسارت کے باوجود امام (ع) کے اس اعلیٰ اور پسندیدہ اخلاق کی وجہ سے میں شرمندگی سے زمین میں گڑا جارہا تھا لہٰذا بندوں کے پیچھے چھپتا چھپاتا ان کے حضور سے کھسک گیا۔ اس واقعے کے بعد جب بھی میں ان کو دیکھتا، لوگوں کے درمیان اپنے آپ کو چھپالیتا۔ اس کے بعد میرے نزدیک امام (ع) اور ان کے والد سے بڑھ کوئی محبوب نہ تھا۔ (11)

تواضع وانکساری

تواضع وانکساری حلم و تقویٰ سے پیدا ہوتی ہے۔ معاشرہ میں جو لوگ صاحب ثروت و جاہ مقام، تھوڑے بہت مشہور، گھر و خاندان، بہت عزت واحترام اور بلند پایہ ہوتے ہیں اکثر خود پسند اور متکبر ہو جاتے ہیں۔ جناب سید الشہدا علیہ السلام اپنے مقام و علم، اپنی اجتماعی چاہت جو آپ کو خاندان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرد کی حیثیت سے حاصل تھی، ثروت و اختیار کے باوجود جو آپ کو اپنے عظیم نانا، والد محترم، والدہ گرامی اور برادر بزرگ سے وراثت میں ملی تھیں۔ اپنی شجاعت وطاقت واختیار وسیع کی موجودگی کے ہوتے ہوئے ان بہادر و دلیر و قوی جوانوں کی معیت کے باوجود جو ہر وقت آپ کے احکام کے منتظر رہتے تھے، لوگوں کے ساتھ نہایت انکساری و تواضع سے پیش آئے تھے۔

"روی العیاشی عن مسعدۃ قال: مر الحسین بن علی علیہما السلام بمساکین قد بسطوا کساء لھم والقو علیہ کسرا، فقالوا: ھلم یا بن رسول اللہ، فثنی ورکہ فأکل معھم ثم تلا: "اِنَّہ لا یُحِبُّ المستکبرین" (نحل ۳۲)

"ثم قال: قد اجبتکم فاجیبونی، فقاموا معہ حتی اتوا منزلہ، فقال للجاریۃ: اخرجی ما کنت تدخرین" (12)
یعنی: "عیاشی نے روایت کی ہے کہ ایک دن حضرت حسین بن علی علیہ السلام کا گزر غریبوں اور مسکینوں کے پاس سے ہوا جنہوں نے دستر خوان لگایا ہوا تھا جس پر روٹی کے خشک ٹکڑے پڑے ہوئے تھے انہوں نے امام (ع) سے کہا: اے رسول اللہ (ص) کے فرزند تناول فرمائیں۔ امام (ع) بیٹھ گئے اور ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گئے پھر اس آیت کو تلاوت فرمایا: "بے شک اللہ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا" پھر فرمایا میں نے تمہاری دعوت کو قبول کیا اور تمہارے ساتھ شریک ہوا ہوں اب تم سب

میری دعوت قبول کرو۔ وہ سب اٹھے اور امام (ع) کے ہمراہ ان کے گھر آئے، آپؑ نے کنیز سے کہا: جو کچھ گھر میں ہے لے آؤ۔"

کچھ اور مورخین لکھتے ہیں کہ ایک دن مدینہ کے فقراء کی ایک جماعت نے امام حسین علیہ السلام کو مدعو کیا آپ نے ان کی مہمانی کو قبول کیا اور ان کے درمیان تشریف فرما ہوئے لیکن ان کے کھانے سے کچھ نہیں کھایا بلکہ فرمایا: اگر یہ کھانا مال صدقہ نہ ہوتا تو میں کھالیتا لیکن صدقہ ہم پر حرام ہے۔ پھر کچھ دیر ان کی ہمت افزائی و دلجوئی فرما کر اپنے بیت الشرف واپس آئے اور کافی مقدار میں کھانا، غذا، لباس اور رقم ان میں سے ہر ایک کو بھجوائی۔ (13)

شجاعت و بہادری

علم اخلاق میں طے پایا ہے کہ انسان کی تمام قوتوں کا معتدل ہونا مجموعی طور پر فضائل کا سنگ بنیاد ہے۔ شجاعت یہ ہے کہ انسان کے لیے جس وقت قدم اٹھانا مناسب ہو اور اقدام ضروری ہو اس وقت وہ بے خوف و خطر آگے بڑھے اور اپنے فریضے کو پورے طور پر ادا کرے چاہے اس سلسلے میں اُسے جان بھی دینا پڑے اور جس موقعہ پر اقدام مناسب نہ ہو بلکہ سکوت کی ضرورت ہو اس وقت وہ تحمل سے کام لے چاہے کتنی ناگوار صورتوں کا مقابلہ کرنا پڑے اور اس میں کتنی ہی مشکلات درپیش کیوں نہ ہوں۔

امام حسین علیہ السلام دونوں معنوں میں شجاع اور بہادر تھے۔ حضرت کی شجاعت کی یہ کیفیت تھی کہ ایک دن مدنیہ میں امام حسین علیہ السلام اور حاکم مدینہ ولید بن عقبہ کے درمیان ایک کھیت پر تنازع کھڑا ہو گیا۔ امام (ع) نے ولید کے سر سے عمامہ اتار لیا اور اس کی گردن میں لپیٹ کر کھینچا۔ مروان نے جب یہ حال دیکھا تو کہنے لگا۔ خدا کی قسم میں آج تک کسی شخص کو نہیں دیکھا جو اس طرح حاکم پر جرأت دکھائے۔ ولید نے کہا قسم خدا کی تو نے یہ جملہ میری طرف داری اور حمایت میں نہیں کہا بلکہ تو نے میرے حلم اور بردباری پر حسد کیا ہے یہ کھیت انہی کا ہے۔ امام (ع) نے فرمایا اب جب کہ تو نے حق کا اقرار کر لیا ہے میں نے وہ مزرعہ تجھے بخش دیا ہے یہ کہہ کر آپ وہاں سے چلے آئے۔ (14)

یہ واقعہ جہاں امام (ع) کی جرأت اور شجاعت پر دلالت کرتا ہے وہاں آپ کی جوانمردی اور اعلیٰ ظرفی پر بھی شاہد ہے نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام (ع) نے ولید پر ناحق چڑھائی نہیں کی تھی۔

معرکہ کربلا میں جب امام عالی مقام سے یزید کی اطاعت قبول کرنے کے لیے کہا گیا تو آپ نے فرمایا: ”لا واللہ لا اعطیکم بیدی اعطاء الذلیل، ولا افر فرار العبید“یعنی: ”خدا کی قسم! نہ میں ذلیل لوگوں کی طرح تمہاری بیعت اور اطاعت کروں گا اور نہ ہی میں غلاموں کی طرح فرار کروں گا۔“ پھر بلند آواز میں سے فرمایا: یا عباد اللہ! میں اپنے اور تمہارے رب سے متکبر کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جو روز حساب پر ایمان نہیں رکھتا۔ پھر فرمایا: ”موت فی عز خیر من حیاۃ فی ذلّ“ یعنی: ”عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے۔“ آپ نے بروز شہادت یہ شعر پڑھا:

الموت خیر من رکوب العار　　　والعار اولی من دخول النار واللہ ماھذا جاری

حاصل مطلب یہ ہے کہ:

یعنی: ”موت ننگ و عار سے بہتر ہے اور ننگ و عار جہنم میں جانے سے بہتر ہے لہٰذا بخدا! ذلت برداشت کرنا ممکن نہیں ہے موت قبول کی جاسکتی ہے۔“ (15)

امام (ع) نے جہاں ان اشعار میں زندگی اور موت کے فلسفہ کو واضح کیا ہے وہاں یہ باتیں آپ کی شجاعت اور بہادری، موت سے نہ ڈرنا، ذلت کو قبول نہ کرنے پر بین ثبوت ہیں۔ ان کلمات سے آپ کے عزم و حوصلے اعلیٰ اہمیت اور روح کی بلندی کی غمازی ہوتی ہے۔ امام (ع) نے اس ننگ و عار یعنی یزید کی بیعت کو قبول نہ کرنے کی وجہ بھی بیان فرمائی ہے۔ روز عاشورہ جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو حضرت نے ان کی ہدایت کے لیے خطبہ ارشاد فرمایا اسی میں یہ جملے بھی بیان کیے۔

”اَلاَ وَاِنَّ الدَّعِیَّ ابْنَ الدَّعِیَّ قَدْ رکنبین اثنتین بین السِّیکۃِ والذِلَّۃِ وھیھات مِنَّا الذِّلَّۃِ، یَأبِیَ اللہُ ذلکَ لَنٰا وَرَسُولُہُ والمُؤمِنُونَ و حجورَ طَابَتْ وطَھُرَتْ وَاَنُوفٌ حَمِیَّۃٌ ونُفُوسٌ اَبِیَّۃٌ من ان نُؤثِرَطاعَۃَ اللّیام علیٰ مَصَاریح الکرام الاُاِنِّی زاحف بِھذِہِ الاُسْرَۃِ مَعَ قِلَّۃِ العَدَدِ وَخِذْلَۃِ النَّاصر۔ (16)

یعنی: ”آگاہ رہو اس حرام زادے اور حرام زادے کے بیٹے نے ہمیں ذلت اور موت کے دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے اور ہم کبھی بھی ذلت کو قبول نہیں کریں گے یہ بات ہمارے لیے نہ ہی اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہے، نہ ہی صاحبان ایمان اور وہ گودیں جنہوں نے ہمیں پروان چڑھایا ہے، صاحبان غیرت و حمیت، ظلم و ستم کو قبول کرنے والے اور ذلت قبول کرنے والے تمام افراد ہمیں اجازت نہیں دیتے کہ ہم اس

ذلت اور ننگ وعار کو گوارا کرلیں اور پست اور فرومایہ شخص کی اطاعت کو آبرو مندانہ موت پر ترجیح دیں آگاہ رہو، اگر چہ ہم بے یارومددگار ہیں، میں اپنے خاندان کے انہی قلیل تعداد کے ساتھ تم سے جنگ کروں گا۔"

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:"واما الحسین فان له جودی وشجاعتی"(17) یعنی: " حسین کو میری شجاعت اور سخاوت میراث میں ملی ہے۔" امام (ع) نے میدان کربلا میں اپنے نانا کی شجاعت و بہادری کا عملی طور پر نقشہ پیش کیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ حسین علیہ السلام غمزدہ، دل شکستہ، تشنہ و گرسنہ ہونے کے باوجود تن تنہا جب تلوار کھینچ کر فوج مخالف پر حملہ آور ہوئے تو تمام گزشتہ بہادوروں کے کارنامے محو ہوگئے اور انسانی حافظہ میں قیامت تک اس شجاعت وجرأت کی تصویر محفوظ رہ گئی۔

مگر یہ غیر مساوی جنگ ظاہری اعتبار سے اب عنقریب ختم ہونے والی تھی اس لیے کہ ایک کا ہزاروں سے مقابلہ کہاں تک جاری رہ سکتا تھا۔ تاہم آپ نے اپنے دشمنوں کے دلوں میں وہ دھاک بٹھادی تھی کہ ان میں کوئی بھی آپ کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔یزیدی فوج کی اس سراسیمگی کو دیکھ کر شمر نے فوج کو للکارا اور نئے سرے سے لشکر کی ترتیب کی، سواروں کو پیاروں کے پیچھے کھڑا کیا اور تیر اندازوں کو حکم دیا کہ وہ تیر باراں کریں اتنی شدت سے تیر برسائے گئے کہ جسم حسینؑ ساہی کے کانٹوں کی طرح ہوگیا۔

اس وقت شمر نے چلا کر کہا" خدا تم سے سمجھے کھڑے کیا دیکھ رہے ہو انہیں قتل کرو خدا کرے تمہاری مائیں تم پر روئیں"اس طرح غیرت دلائے جانے کے بعد لشکر بیکراں حسینؑ پر چاروں طرف سے ٹوٹ پڑا اور آپ پر تیروں، تلواروں اور نیزوں کا مہینہ برسنے لگا جس سے یقین ہے کہ گھوڑا بھی کافی زخمی ہو گیا ہوگا اور اس سے مجبور ہو کر آپ زین ذوالجناح سے زمین پر تشریف لائے، مگر پیادہ ہونے کے بعد بھی آپ نے مقابلہ جاری رکھا۔(18)

اب شمر نے پیادوں کو اپنے ساتھ لے کر خود آپ کا محاصرہ کر لیا مگر عالم یہ تھا کہ جس طرف آپ رخ کرتے تھے ادھر کی جماعت منتشر ہو جاتی تھی۔(19)

حمید بن مسلم نے اسی موقع کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا کہ میں نے کوئی ایسا انسان نہیں دیکھا جو زخمی ہو چکا ہو اور اس کے اولاد، عزیز اور ساتھی سب قتل ہو چکے ہوں تو پھر حسینؑ کی طرح مطمئن اور ثابت قدم

نظر آئے اور ان کی طرح ہمت و حوصلے سے مقابلے کرئے۔ حالت یہ تھی کہ پیادے چاروں طرف سے انہیں گھیرتے تھے اور وہ تلوار لے کر ان پر حملہ کر دیتے تو وہ سب دائیں بائیں سے یوں ہٹتے تھے۔ جیسے بھیڑوں کا ریوڑ کے حملہ کے وقت منتشر ہوتا ہے۔(20)

حضرت امام سجاد علیہ السلام سے مروی ہے کہ امام حسین علیہ السلام پر جتنے مصائب بڑھتے جا رہے تھے ان کا چہرے کا رنگ کھلتا جا رہا تھا اور اطمینان بڑھتا جا رہا تھا یہاں تک کہ فوج اشیقاء کے بعض لوگوں نے کہا: حسینؑ کو دیکھو کہ آپ کے چہرے سے جھلک رہا ہے کہ آپ کو کسی قسم کا خوف نہیں ہے۔(21)

انسانی ہمدردی

یہ صفت در حقیقت امام عالی مقام کی صفات حسنہ بخشش و کرم کی شاخ کی طرح ہے کیونکہ جب بھی کوئی انسان بلند اور اعلیٰ صفات کا حامل ہوتا ہے تو وہ دوسروں سے مہربانی اور محبت سے پیش آتا ہے جس طرح بادل زمین پر اور سورج دیگر ستاروں پر محبت و مہربانی کرتا ہے۔ واقعہ کربلا کے بعد آپ کے کاندھے پر ایک گہرا زخم مشاہدہ کیا گیا، ظاہر یوں لگتا تھا کہ یہ تلواروں کا زخم ہے جنہوں نے اس زخم کو بغور دیکھا وہ سمجھ گیا کہ یہ عام زخم نہیں ہے امام سجاد علیہ السلام سے اس زخم کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ نشان زخم ان بوریاں کا ہے جو امام حسین علیہ السلام راتوں کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر بیواؤں، یتیموں اور مسکینوں تک پہنچاتے تھے۔(22)

دوستوں کے ساتھ مراعات اور سلوک کرنا ایک معتدل فطرت انسان کا خاصہ ہوتا ہے اور یہ کوئی غیر معمولی امر نہیں ہے لیکن دشمنوں کے ساتھ احسان کرنا اور ان لوگوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا جو جنگ کرنے کے لیے آئے ہوں اور اپنے خون کے پیاسوں کے کام آنا ہر ایک کا کام نہیں بلکہ یہ اعلیٰ انسانی صفت امام حسین علیہ السلام کے کردار میں ملتی ہے۔

امام حسین علیہ السلام کا قافلہ جب منزل شراف پر پہنچا تو امامؑ نے حکم دیا کہ پانی بھر لو، مشکیں اور چھاگلیں پُر کر لو۔ اس منزل سے قافلہ جب آگے بڑھا تو ذوحسم کے مقام پر حر کے لشکر سے سامنا ہوا۔ امام اپنے اصحاب سمیت عمامے سروں پر رکھے تلواریں حمائل کیے کھڑے تھے کہ دشمن کے ہانپتے گھوڑے اور سوار سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ پیاس کی شدت سے ان کا برا حال تھا امام حسین علیہ السلام ایک حساس دِل رکھتے تھے جس میں انسانی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ آپ کے لیے دشمن یہ حالت ناقابل برداشت تھی آپ نے

اپنے نوجوانوں کو حکم دیا کہ مشکیزوں کے منہ کھول دیے جائیں اور تمام فوج کو پوری طرح سیراب کیا جائے۔ حکم کی دیر تھی کہ اطاعت امام پر کم بستہ جوان کھڑے ہوگئے اور سب کو سیراب کیا۔

علی بن طفان محاربی حر کا ایک ساتھی تھا وہ کہتا ہے کہ پیاس کے مارے میرا بُرا حال تھا اور میں سب سے آخر میں پہنچا۔ جب امام حسین علیہ السلام نے میری اور میرے گھوڑے کی پیاس کو دیکھا تو فرمایا: روایہ (یعنی شتر آبکش کو) بٹھالو، میری زبان میں راویہ مشک کو کہتے تھے اس لیے میں اس کے معنی نہ سمجھا۔ حضرت نے فرمایا: جمل یعنی اونٹ کو بٹھالو میں نے اونٹ کو بٹھایا، حضرت نے فرمایا اب پانی پیو مگر میں اتنا بد حواس تھا کہ جتنا پینے کی کوشش کرتا پانی زمین پر بہتا اور منہ میں نہ جاتا۔ امام (ع) خود اٹھے اور میرے پاس آکر مشک کے دہانے کو ٹھیک کرکے مجھے دیا میں نے خود بھی پانی پیا اور گھوڑے کو سیراب کیا۔([23])

یہ امام حسین علیہ السلام کی اعلی ظرفی اور بلند اخلاقی کا بین ثبوت ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے مقابلے پر جو افراد تھے وہ انتہائی پست فطرت اور ذلیل تھے۔ انہوں نے امامؑ کے اعلیٰ اخلاق کا جواب ان پر اور ان کے اہل و عیال پر پانی بند کر دینے سے دیا۔

*****

حوالہ جات

1۔ عماد زادہ، عماد الدین اصفہانی، سیرت سید الشہدا، امامیہ پبلی کیشنز لاہور، جلد ا، ص ۲۴

2۔ ابن قتیبہ دینوری، الامامۃ والسیاسۃ، مکتبہ مصطفیٰ البابی الحلبی، ۱۳۸۲ھ، ق، ج ا، ص ۱۸۴

3۔ علی نقی نقن، شہید انسانیت، امامیہ مشن پاکستان، ٹرسٹ لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۱۵۹

4۔ حافظ ابن عساکر، تاریخ مدینہ دمشق، ترجمہ امام حسینؑ، تحقیق محمد باقر محمودی، موسسہ الاعلمی بیروت، ج ۴، ص ۳۲۳

5۔ مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، ج ۴۴، ص ۱۹۶۔۱۹۷، دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۹۸۳ء

6۔ مجلسی، ایضاً، ص ۱۹۰، حافظ ابن عساکر، ایضاً، ص ۱۶۰

7۔ حسنی، ہاشم معروف، سیرۃ الائمہ الاثنی عشر، بیروت، ج ۲، ص ۳۱

8۔ شیخ جعفر شوستری، الخصائص، الحسینہ، مکتب اہل بیت، کراچی، ص ۱۳۲

9۔ مقرم، عبدالرزاق، مقتل الحسین (علیہ السلام)، بیروت، ص ۳۴۵
10۔ مالکی، ابن صباغ، الفصول المھمہ، ذوی القربی، قم، ص ۱۵۹
11۔ قمی، شیخ عباس، منتھی الامال، ج ۱، ص ۵۳۱
12۔ سمرقندی، محمد بن مسعود، تفسیر عیاشی، کتابفروشی اسلامیہ تہران، ج ۲، ص ۲۵۷، بحرانی، سید ہاشم، البرہان، فی تفسیر القرآن، موسسہ الاعلی بیروت، ج ۲، ص ۳۶۳
13۔ عمادزادہ، ایضاً، ج ۱، ص ۸۸
14 ۔ مجلسی، بحار الانوار، ج ۴۴، ص ۱۹۱، موسسہ الوفاء، بیروت
15۔ مجلسی، بحار، ج ۴۴، ص ۱۹۱
16۔ ابن طاوؤس، سید علی بن طاوؤس حلی، اللھوف فی قتلی الطفوف، نجف، ص ۹۶
17۔ مفید، محمد بن نعمان، الارشاد، موسسہ، اہل بیت، قم، ص ۱۹۱
18۔ طبری، محمد بن جریر، تاریخ الامم والملوک، موسسہ الاعلمی، بیروت، ج ۶، ص ۲۵۸
19۔ طبری، ایضاً، ص ۲۵۹
20۔ مفید، محمد بن نعمان، الارشاد، موسسہ آل البیت قم، ص ۲۵۶
21۔ شیخ جعفر شوستری، الخصائص مکتب اہل البیت، کراچی، ج ۱، ص ۱۳۲
22۔ مجلسی، ایضاً، ص ۱۹۱، امین، سید محسن، اعیان الشیعہ، دار التعارف، بیروت، ج ۴، ص ۱۳۲
23۔ طبری، ایضاً، ص ۲۴۷، مفید، ایضاً، ص ۲۳۴

اقتصادی عدالت نہج البلاغہ کی روشنی میں

روشن علی*

خلاصہ

اقتصاد کا لغوی معنیٰ ''میانہ روی اور اچھا چال چلن'' ہے۔ اصطلاح میں ایسے وسائل کی دریافت کو ''اقتصاد'' کہتے ہیں جو دولت وثروت پیدا کرنے کے مناسب طریقے، اس کے خرچ کے صحیح استعمال کے حقیقی اسباب بتا سکیں۔ نیز عدل کے معنی کسی بوجھ کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرنا ہے، ہر حقدار کو اس کا حق دینا، کسی چیز کو اپنے موزوں مقام پر رکھنا وغیرہ ہیں۔ حضرت امام علی (ع) کے معاشی نظام پر نظر کی جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آپ نے جو اقتصادی نظام دیا اس میں کاروبار اور تجارت کی آزادی کے ساتھ پیداواری وسائل عوام کی ملکیت تھے اور ہر شخص معیشت کے مختلف ذرائع اختیار کرنے میں آزاد تھا۔ حضرت علی ابن ابی طالب (ع) نظام معیشت کو اس نہج پر قائم کرنا چاہتے تھے، کہ ہر انسان کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ حضرت علی (ع) کے مطابق مسلمانوں کا ذاتی مال، مال فیٔ، خمس، صدقات اور خراج اقتصادیات کی بنیاد ہیں۔

حضرت امام علی (ع) کے نزدیک ذخیرہ اندوزی ملک اور ملت کے لیے انتہائی نقصان دہ چیز ہے۔ اگر کوئی تاجر ذخیرہ اندوزی کرے تو حکومت ایسے تاجروں کے خلاف ایسے اقدام کرے کہ وہ اپنی اس حرکت سے باز آجائیں۔ آپ کی نظر میں خراج اور ٹیکس ادا کرنے والوں کی اصلاح بھی ضروری ہے اور خراج دینے والوں کی اصلاح کی بدولت ہی دوسروں کے اقتصادی حالات بھی درست کیے جا سکتے ہیں۔ حضرت علی (ع) زکوۃ جمع کرنے والوں کو عوام کے ساتھ زیادتی نہ کرنے اور مال کو مالک کی مرضی کے مطابق تقسیم کرنے کی خصوصی ہدایت کرتے تھے۔ آپؑ نے جب اقتدار سنبھالا تو پیغمبر اکرم (ص) کی سنت کے مطابق ہر شہر کا بیت المال اُسی شہر کے مستحقین میں تقسیم کیا۔ امام (ع) کے نزدیک بیت المال غریبوں، ناداروں، یتیموں، بوڑھوں اور مسکینوں کا حق ہے۔

حکومت کی ذمہ داری ہے کہ عوام میں سے جو یتیم ہیں یا یتیموں کی پرورش کرنے والے ہیں اور جو بہت ہی بوڑھے ہو چکے ہیں ان کے حقوق کا خاص خیال رکھے۔ امام علیؑ اپنے خطبوں، خطوط اور اقوال میں اپنے تمام گورنروں کو عدل قائم کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ عدل اور انصاف کا ایک حصّہ اقتصادی انصاف اور مالی امور کے توازن کے ساتھ مخصوص ہے۔ آپ کی نظر میں اگر مالیات دینے والے کسی مشکل کی وجہ سے ٹیکس اور خراج کی گرانباری کی شکایت کریں تو خراج کے وصول میں کمی کی جائے۔ حضرت علی (ع) کے مطابق مسلمان حکمران کی ایک اہم ذمہ داری بیت المال کی جمع آوری اور اس کی نگرانی ہے۔ بیت المال کے حوالے سے حضرت علی علیہ السلام کی ایک روش یہ بھی تھی کہ آپ بیت المال سے غصب کیے ہوئے اموال واپس لوٹاتے تھے اور عاملین زکوۃ اور گورنروں کو ہدایت و نصیحت کرتے اور انہیں بیت المال میں خیانت کرنے کے نتائج سے آگاہ فرماتے تھے۔

---

*۔ اسسٹنٹ پروفیسر اسلام آباد ماڈل کالج فار بوائز، ایف 10/3 اسلام آباد

ا۔ اقتصادی عدالت کا معنی و مفہوم

اقتصاد کا لغوی معنی "میانہ روی اور اچھا چلن" ہے۔ اصطلاح میں ایسے وسائل کی "دریافت" کو اقتصاد کہتے ہیں جو دولت و ثروت پیدا کرنے کے مناسب طریقے، اس کے خرچ کے صحیح استعمال اور اس کی نابودی اور بربادی کے حقیقی اسباب بتا سکیں۔ جہاں تک عدالت اور عدل کا تعلق ہے تو "عدل" کے معنی کسی بوجھ کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرنا اور ہر حقدار کو اپنا حق دینا یا کسی چیز کو اپنے موزوں مقام پر رکھنا وغیرہ ہیں۔

اقتصادی عدالت سے مراد: بیت المال کی تقسیم میں عدل و انصاف قائم کرنا اور ہر حقدار کو اس کا حق دینا ہے۔ اقتصادی عدل و انصاف کو اسلام کا سب سے بڑا مقصد سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ تمام انبیاء علیہم السلام بھی اسی عدل و انصاف کو قائم کرنے کے لیے مبعوث ہوئے۔ بنیادی طور پر کوئی بھی قوم یا مکتبِ فکر، سماجی انصاف کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ سماجی عدل اور انصاف کا تعلق براہ راست قوموں اور حکومتوں کی بقاء سے ہے۔

یہاں ہم حضرت علی علیہ السلام کے کلام کی روشنی میں نہج البلاغہ سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں جن سے واضح ہو جائے گا کہ امام (ع) نظام معیشت کو عدل کی بنیادوں پر استوار کر کے طبقاتی تفریق کی راہیں بند کرنا چاہتے تھے، تاکہ معاشرے میں معاشی توازن قائم کیا جاسکے اور معاشرہ غربت اور امارت کے لحاظ سے دو طبقوں میں اس طرح نہ بٹ جائے کہ ایک طرف فلک بوس عمارتیں ہوں، توں دوسری طرف شکستہ جھونپڑے۔ ایک طرف فاخرہ ملبوسات ہوں، تو دوسری طرف پھٹے پرانے کپڑے۔ ایک طرف امراء بلکہ ان کے کتے بھی شکم سیر ہوں، تو دوسری طرف فاقوں سے دم توڑتے ہوئے انسان۔

حضرت امام علی (ع) کے معاشی نظام پر نظر کی جائے تو یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ کاروبار اور تجارت کی آزادی کے ساتھ پیداواری وسائل عوام کی ملکیت ہیں اور ہر شخص معیشت کے مختلف ذرائع، یعنی زراعت، تجارت، دستکاری، صنعتکاری وغیرہ کے اختیار کرنے میں آزاد تھا۔ امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نظام معیشت کو اس نہج پر قائم کرنا چاہتے تھے کہ ہر انسان کی ضروریات پوری ہوں۔ پیداوری وسائل اور معیشت کے جملہ شعبوں میں سب کے حقوق مساوی ہوں اور سب کو سعی و کاوش اور کسب وکار کے یکساں مواقع میسر ہو سکیں۔ امیر المؤمنین (ع) فقیروں اور مسکینوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

"ان اللہ فرض فی اموال الاغنیاء اقوات الفقراء فما جاع الفقیر الا بما متع بہ غنی واللہ تعالیٰ سائلھم عن ذالک۔" (1)

یعنی: "اللہ تعالی نے دولتمندوں کے مال میں فقیروں کی روزی کا حصہ رکھا ہے؛ اگر کوئی فقیر بھوکا رہتا ہے تو اس لیے کہ دولت مند نے دولت کو سمیٹ لیا ہے اور اللہ تعالی ان سے اس کا مواخذہ کرنے والا ہے۔"

۲۔ اقتصادیات کی بنیاد

یہاں ہم ان چیزوں کو واضح کریں گے جن سے معیشت حاصل ہوتی ہے۔ وہ اشیاء جو اقتصادیات کی بنیاد ہیں، ان میں سے چند ایک کا ذکر حضرت علی علیہ السلام یوں کرتے ہے:

"انّ ھٰذالقرآن انزل علی النّبیّ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم و الاموالُ اربعۃٌ: اموال المسلمین فقسّمھا بین الورثۃ فی الفرائض؛ و الفیء فقسّمہ علی مستحقیہ؛ والخمس فوضعہ اللہ حیث وضعہ؛ و الصدقات فجعلہ اللہ حیث جعلھا۔" (2)

یعنی: "جب قرآن نبی (ص) پر نازل ہوا، تو اس وقت چار قسم کے اموال تھے۔ ایک مسلمانوں کا ذاتی مال تھا، اسے آپ (ص) نے ان کے وارثوں میں ان کے حصہ کے مطابق تقسیم کیا۔ دوسرا مال فَیئَ تھا اسے اس کے مستحقین پر تقسیم کیا۔ تیسرا مال، خمس کا تھا اس مال کے اللہ تعالی نے خاص مصارف مقرر کر دیئے ہیں۔ اور چوتھا صدقات کا مال تھا، انہیں اللہ نے وہاں صرف کرنے کا حکم دیا جو ان کا مصرف ہے۔"

اس قول میں درج ذیل چار قسم کے اموال کا ذکر ہے: ۱) مسلمانوں کا ذاتی مال؛ ۲) مال فئ؛ ۳) خمس؛ ۴) صدقات۔ یہاں ان میں سے ہر ایک کی مختصر وضاحت کی جاتی ہے۔

ا۔ مسلمانوں کا ذاتی مال

مسلمانوں کا وہ مال جو انہوں نے جائز طریقے سے کمایا ہے، وہ ان کا ذاتی مال ہے، جس کو وہ اپنی مرضی سے اللہ تعالی کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق خرچ کر سکتے ہیں۔ اس مال کے متعلق قرآن مجید میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

" وَ لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ وَ اسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا۔" (3)

یعنی: " اور خبردار جو خدا نے بعض افراد کو بعض سے کچھ زیادہ دیا ہے اس کی تمنا نہ کرنا۔ مردوں کے لیے وہ حصہ ہے جو انہوں نے کمایا ہے اور عورتوں کے لیے وہ حصہ ہے جو انہوں نے کمایا ہے۔ اللہ سے اس کے فضل کا سوال کرو، کہ وہ بیشک ہر شے کا جاننے والا ہے۔"

اس آیت کریمہ سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ مردوں اور عورتوں میں سے جس نے جتنا کمایا ہے وہ اس کا ذاتی مال ہے، چاہے کتنا ہی ہو۔ دوسرا وہ مال جو ان کے والدین یا رشتہ دار ترکہ کے طور پر چھوڑ جائیں وہ انہیں میراث میں ملے، تو وہ بھی ان کا ذاتی مال ہے۔ جس کے متعلق اللہ تعالی قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا۔" (4)

یعنی: " اور جو مال ماں باپ اور قریبی رشتہ دار چھوڑ جائیں اور اس میں مردوں کا ایک حصہ ہے اور ایسا ہی جو مال والدین اور قریبی رشتہ دار چھوڑ جائیں اس میں تھوڑا ہو یا بہت عورتوں کا بھی ایک حصہ ہے۔ یہ حصہ ایک طے شدہ امر ہے۔"

۲۔ مال فیٔ

جو مال مسلمانوں کو کفار سے بغیر جنگ مل جائے، چاہے کفار میدان جنگ میں وہ مال چھوڑ کر بھاگ جائیں یا وہ مسلمانوں کو جزیہ اور ٹیکس دینے پر راضی ہو جائیں، ان دونوں صورتوں میں حاصل شدہ مال کو مالِ فیٔ کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ" (5)

یعنی: " نیز جو کچھ اللہ اپنے رسول کو ان یہود سے لوٹا دے تو وہ ایسی چیز ہے جس پر قبضہ کرنے کے لئے (تم نے کوئی زحمت نہیں اُٹھائی) نہ تم نے اس کے لئے گھوڑے دوڑائے، نہ کوئی اُونٹ۔ لیکن اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہے مسلط فرما دیتا ہے۔"

۳۔ خمس

اپنے مال میں سے اللہ کی راہ میں پانچواں حصہ نکالنے کو خمس کہا جاتا ہے۔ خمس کے بارے میں قرآن مجید میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِی الْقُرْبٰى وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ'' یعنی: '' اور جان لو کہ جو غنیمت تم نے حاصل کی ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ، اس کے رسول اور قریب ترین رشتہ داروں اور یتیموں اور مساکین اور مسافروں کے لیے ہے، اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو۔'' (6)

۴۔ صدقات (زکوۃ، خیرات وغیرہ)

صدقات کا دائرہ بہت وسیع ہے، جس میں زکوۃ، خیرات وغیرہ شامل ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے: '' اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ'' (7) یعنی: '' نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو۔''اسی طرح حضرت علی (ع) کا نہج البلاغہ میں ارشاد ہے: ''و ایتاء الزکوٰۃ فانّھا فریضۃ واجبۃ'' (8) یعنی: ''زکوۃ کا ادا کرنا؛ یقینا یہ ایک واجب فریضہ ہے۔'' زکوۃ کے بارے میں ایک اور خطبہ میں امام (ع) ارشاد فرماتے ہیں:

''انّ الزکوٰۃ جعلت مع الصلوٰۃ قرباناً۔۔۔ حجازاً ووقایۃً۔'' (9)

یعنی: ''مسلمانوں کے لیے نماز کے ساتھ زکوۃ کو اللہ تعالی کے قرب حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے، جو شخص اسے اللہ تعالی کی خشنودی کے لیے ادا کرے گا، اس کے لیے یہ گناہوں کا کفارہ اور دوزخ سے بچاؤ کا ذریعہ ہے۔''

صدقات کے بارے میں ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں کہ: '' سوسوا ایمانکم بالصدقۃ وحصّنوا اموالکم بالزکوٰۃ'' (10) یعنی: '' صدقہ دے کر اپنے ایمان کی حفاظت کرو اور زکوۃ دے کر اپنا مال بچاؤ۔''اسی طرح قرآن مجید میں بھی اللہ تعالی کا ارشاد ہے: '' خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّیْهِمْ بِهَا'' (11) یعنی: ''اُن کے اموال میں سے صدقہ (زکوۃ) لے لو تاکہ انہیں اس کے ذریعہ پاک کر دو

اور ان کی تربیت کرو۔" ان چار کے علاوہ اور بہت سے طریقے ہیں جہاں سے مال کا حصول کیا جا سکتا ہے، ان میں سے چند اہم طریقوں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

۵۔ خراج

اقتصادیات کا ایک اہم ذریعہ خراج ہے، جو کہ عوام اپنی حکومت کو ادا کرتی ہے۔ خراج حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ حکومت خراج ادا کرنے والوں کی اصلاح کو پیش نظر رکھے، کیونکہ جیسے آبادی زیادہ ہو گی تو ویسے وہ زیادہ سے زیادہ خراج ادا کریں گے۔ حضرت علی علیہ السلام اپنے گورنر مقرر کرتے وقت ہدایت کرتے ہیں:

"وتفقّد امرالخراج۔۔۔ کلّھم عیالٌ علی الخراج و اھلہ۔" (12)

یعنی: "خراج کے معاملہ میں خراج ادا کرنے والوں کی اصلاح و مفاد پیش نظر رکھنا، خراج اور خراج دینے والوں کی اصلاح کی بدولت ہی دوسروں کے حالات درست کیے جا سکتے ہیں۔ اور ان کے بغیر اصلاح ممکن ہی نہیں؛ اسی لیے کہ سب انسانوں کا دار و مدار خراج اور خراج دینے والوں پر ہی ہے۔"

۶۔ زمین کی آبادکاری

اقتصادیات کے حصول کا دوسرا اہم ذریعہ زمین کی آبادکاری (زراعت) ہے۔ جتنی زمین زرخیز ہو گی اور اس کی دیکھ بھال کی جائے گی، اتنا ہی زیادہ فائدہ ہو گا۔ اس سے ملک اور قوم خوشحال ہو جائے گی۔ لہٰذا حکومت پر لازم ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ زمین کی آبادی پر توجہ دے کیونکہ کھانے اور پہننے وغیرہ کی چیزوں کا دار و مدار زمین کی آبادکاری پر ہوتا ہے۔ حضرت علی (ع) زمین کی آبادکاری کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

"ولیکن نظرك فی عمارۃ الارض ابلغ من نظرك فی استجلاب الخراج۔۔۔ و اھلك العباد ولم یستقم امرہ الّا قلیلًا۔" (13)

یعنی: "خراج کی جمع آوری سے زیادہ زمین کی آبادکاری کا خیال رکھنا، کیونکہ کہ خراج بھی تو زمین ہی کی آبادی سے حاصل ہوتا ہے۔ جو آباد کئے بغیر خراج چاہتا ہے، وہ ملک کی بربادی اور بندگانِ خدا کی تباہی کا سامان کرتا ہے۔ اس کی حکومت تھوڑے دنوں سے زیادہ نہیں رہ سکتی۔"

۷.۸۔ تجارت اور صنعت

تجارت اور صنعت اقتصادیات کے حصول کے اہم ذرائع ہیں۔ کسی بھی ملک کی ترقی کا دار و مدار تجارت اور صنعت پر ہوتا ہے۔ اسی لیے ضروری ہے کہ حاکم، تجارت اور صنعت کے فروغ کی ہر ممکن کوشش کرے، تاجروں اور صنعت گروں کی ہر ممکن مدد کرے اور انہیں تمام سہولیات فراہم کرے، کہ وہ زیادہ سے زیادہ سرمایہ کمائیں، جس سے ملک اور ملت کو فائدہ پہنچے۔ حضرت علی علیہ السلام اپنے گورنر کو تاجروں اور صنعت گروں کا خیال رکھنے کا حکم دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

”ثم استوص بالتجار و ذوی الصناعات و اوص بهم خیرا۔۔۔ فإنّهم سلم لا تخاف بائقته و صلح لا تخشی غائلته و تفقد امورهم بحضرتك وفی حواشی بلادك۔“ (14)

یعنی: ”پھر تمہیں تاجروں اور صنعت گروں کے خیال رکھنے کی اور ان کے ساتھ اچھے برتاؤ کی ہدایت کی جاتی ہے اور تمہیں دوسروں کو ان کے متعلق ہدایت کرنا ہے: خواہ وہ ایک جگہ رہ کر بیوپار کرنے والے ہوں، یا پھیری لگا کر بیچنے والے ہوں یا جسمانی مشقت سے کمانے والے ہوں، کیونکہ یہی لوگ منافع کا سرچشمہ اور ضروریات کے پورا کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ان ضروریات کو خشکی، تری، میدانی علاقوں اور پہاڑوں ایسے دور افتادہ مقامات سے درآمد کرتے ہیں اور ایسی جگہوں سے جہاں لوگ پہنچ نہیں سکتے اور نہ وہاں جانے کی ہمت کر سکتے ہیں۔ بے شک یہ لوگ امن پسند اور صلح جو ہوتے ہیں، ان سے کسی شورش کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ یہ لوگ تمہارے سامنے ہوں یا جہاں جہاں دوسرے شہروں میں پھیلے ہوئے ہوں تم ان کی خبر گیری کرتے رہنا۔“

۳۔ ذخیرہ اندوزی کی روک تھام

ذخیرہ اندوزی ملک اور ملت کے لیے انتہائی نقصان دہ چیز ہے۔ اگر کوئی تاجر ذخیرہ اندوزی کرے، تو حکومت ایسے تاجروں کے خلاف ایسے اقدام کرے کہ وہ اپنی اس حرکت سے باز آجائیں۔ کیونکہ ذخیرہ اندوزی کرنے والے تاجر تنگ نظر اور کنجوس ہوتے ہیں، لہٰذا حکومت ان تنگ نظر اور کنجوس تاجروں کو

ذخیرہ اندوزی سے سختی کے ساتھ روکے۔ اگر منع کرنے کے باوجود بھی ذخیرہ اندوزی کرے تو اس کو سزا دی جائے۔ حضرت علی علیہ السلام ایسے تاجروں اور صنعت گروں کے بارے میں فرماتے ہیں:

"و اعلم مع ذالك انّ فی کثیرٍ منهم ضیقا فاحشا و شحًا قبیحًا۔۔۔ بعد نهیك ایّاه فنکّل به، وعاقبهٔ فی غیرِ اسرافٍ۔ (15)

یعنی: "اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھو کہ ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو انتہائی تنگ نظر اور بڑے کنجوس ہوتے ہیں۔ جو زیادہ منافع حاصل کرنے کے لیے ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں۔ اونچے نرخ معین کر لیتے ہیں۔ یہ چیز عوام کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے۔ اور حکمرانوں کی بدنامی کا باعث بنتی ہے۔ للذا ذخیرہ اندوزی سے منع کرنا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس سے ممانعت فرمائی ہے۔ اور خرید و فروخت صحیح ترازو اور مناسب نرخوں کے ساتھ بسہولت ہونا چاہیے، کہ نہ بیچنے والے کو نقصان ہو اور نہ خریدنے والے کو خسارہ ہو، اگر منع کرنے کے بعد بھی کوئی ذخیرہ اندوزی کے جرم کا مرتکب تو اسے مناسب حد تک سزا دینا"

۴۔ عوام کے طبقات

اس دنیا میں رہنے والے لوگوں کے کئی طبقات ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتے کیونکہ انسان معاش کے حصول کے لیے ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی اپنی اپنی ذمہ داری اور مقام و منصب ہوتا ہے۔ یہاں پر ان تمام طبقات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ نیز ان میں سے ہر ایک طبقے کی اہمیت اور ذمہ داری کو بھی بیان کیا جا رہا ہے۔ بالخصوص حکومت کی ان طبقات کے متعلق ذمہ داریوں کو واضح کیا جا رہا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں عوام کے آٹھ طبقات اور ان کے فرائض اور ذمہ داریوں کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

"و اعلم انّ الرّعیّة طبقات لایصلح بعضها الّا ببعضٍ۔۔۔ و منها الطّبقة السفلیٰ من ذوی الحاجة و المسکنةِ۔" (16)

یعنی: " تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ رعیت کے کئی طبقات ہوتے ہیں۔ان میں سے ہر طبقے کی فلاح اور بہبود ایک دوسرے سے وابستہ ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ ان میں ایک طبقہ وہ ہے جو اللہ کی راہ میں کام آنے والے فوجیوں کا ہے۔ دوسرا طبقہ عمومی اور خصوصی تحریروں کا کام انجام دیتا ہے۔ تیسرا طبقہ عدل کرنے والے قاضیوں کا ہے۔ چوتھا طبقہ حکومت کے وہ اعمال ہیں جن سے انصاف اور امن قائم ہوتا ہے۔ پانچواں طبقہ جزیہ اور خراج دینے والوں کا ہے، وہ جزیہ دینے والے ذمی اقلیتی ہوں یا خراج دینے والے مسلمان ہوں، چھٹا اور ساتواں طبقہ تاجروں اور صنعت گروں کا ہے۔ آٹھواں طبقہ سب سے کمزور ترین طبقہ ہے وہ فقیروں، محتاجوں، مسکینوں اور ناداروں وغیرہ کا ہے۔"

ان تمام طبقات کا بیت المال میں حصہ معیّن ہے۔ نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام کا اس کے متعلق ارشاد ہے:

"و کلّاً قد سمّی اللّٰہُ سھمہٗ لہٗ و وضع علی حدّہٖ فریضتہٗ فی کتابہٖ او سنّۃِ نبیّہٖ صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم عھدا منہ عندنا محفوظا۔" (17)

یعنی: " اور اللہ تعالی نے ہر ایک کا حق معین کر دیا ہے اور اپنی کتاب یا اپنے نبی صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت میں اس کی حد بندی کر دی ہے اور وہ دستور ہمارے پاس محفوظ ہے۔"

۵۔ بیت المال کے فائدے

حضرت علی علیہ السلام خراج اور ٹیکس ادا کرنے والوں کی اصلاح کے فوائد بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"فاِنّ فی صلاحہ و صلاحھم۔۔۔ النّاس کلّھم عیالٌ علی الخراج و اھلہٖ۔"

یعنی: " یقینا خراج اور خراج دینے والوں کی اصلاح کی بدولت ہی دوسروں کے حالات درست کیے جا سکتے ہیں اور ان کے بغیر اصلاح ممکن نہیں کیونکہ سب انسانوں کا دارومدار خراج اور خراج دینے والوں پر ہی ہے۔" (18)

جب بیت المال میں جمع ہونے والے اموال کے ذرائع کو مضبوط کیا جائے گا اور ان کی اصلاح کی جائے گی تو وہ زیادہ سے زیادہ ٹیکس ادا کریں گے، جب ٹیکس اور خراج زیادہ جمع ہو گا، تو بیت المال خزانے سے بھر جائے گا، ملک خوشحال ہو جائے گا اور عوام کی فلاح و بہبود ہو گی۔ جس کے نتیجے میں ملک میں امن اور امان

قائم ہو جائے گا، فتنہ اور فساد کی جڑیں ختم ہو جائیں گی، کیونکہ تمام جھگڑے زیادہ تر مالی عدم استحکام اور ناانصافی کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ لہٰذا حکومت پر فرض ہے کہ وہ بیت المال کو عوام میں صحیح تقسیم کرے۔ جب بیت المال عوام میں صحیح طور پر استعمال کیا جائے گا، تو عوام حکومت کے دوام کی دعائیں مانگے گے اور حکومت کی حمایت کریں گے۔ اگر حکومت اقتصادی اصلاح کی بجائے عوام پر ٹیکسوں کا زیادہ بوجھ ڈالے گی، تو عوام کنگال اور حکومت کو ختم کرنے کے درپے ہو جائے گی۔ اسی مطلب کی طرف حضرت علی علیہ السلام اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ومن طلب الخراج بغیر عمارۃ۔۔ ولم یستقم امرہ الّا قلیلًا۔" (19)

یعنی: "جو آباد کئے بغیر خراج چاہتا ہے، وہ ملک کی بربادی اور بندگانِ خدا کی تباہی کا سامان کرتا ہے، اس کی حکومت تھوڑے دنوں سے زیادہ نہیں رہ سکتی۔"

اس جملے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خراج اس وقت طلب کیا جائے، جب زمین کی آبادکاری صحیح اور بہتر ہو۔ کیونکہ اس سے ملک اور ملت کی اصلاح ہوتی ہے اور ملک ترقی کرتا ہے۔ جس کے نتیجے میں حکومت زیادہ دیر تک چل سکتی ہے اور اگر بغیر زمین کی آبادکاری اور دیگر ذرائع آمدن کی اصلاح کے خراج اور ٹیکس وصول کیا جائے گا، تو حکومت جلد ہی تباہ و برباد ہو کر ختم ہو جائے گی۔

اسی بیت المال ہی کے ذریعے ملک کو محفوظ کیا جائے گا، ملکی دفاع مضبوط ہو گا اور فوج کو تقویت ملے گی: "لا قوام للجنود الّا بما یخرج اللہ لھم من الخراج الذی یقوون بہ علی جھاد عدوّھم ویعتمدون علیہ فیما یصلحھم ویکون من وراء حاجتھم" یعنی: "افواج کی زندگی کا سہارا وہ خراج ہے، جو اللہ نے اس کے لیے معین کیا ہے، جس سے وہ دشمنوں سے جہاد کرنے میں تقویت حاصل کرتے ہیں اور اپنی حالت کو درست کرتے ہیں اور ضروریات کو بہم پہنچاتے ہیں۔" (20)

۶۔بیت المال کی جمع آوری

(i) عاملین زکوٰۃ کو ہدایات

حضرت علی علیہ السلام جب بھی کسی کو اپنی طرف سے زکوۃ جمع کرنے کے لیے بھیجتے تو اسے درج ذیل ہدایات دیتے تھے:

"امرہٗ بتقوی اللہ فی سرائرِ امرہٖ و خَفِیَّاتِ عملہٖ۔۔۔ فانھم الاخوان فی الدین والاعوان علی استخراج الحقوق۔" (21)

یعنی: "میں انہیں حکم دیتا ہوں کہ اپنے پوشیدہ امور اور مخفی اعمال میں بھی اللہ سے ڈرتے رہیں جہاں اس کے علاوہ کوئی دوسرا گواہ اور نگراں نہیں ہوتا ہے۔ اور خبردار ایسا نہ ہو کہ ظاہری معاملات میں خدا کی اطاعت کریں اور مخفی مسائل میں اس کی مخالفت کریں۔ اس لیے کہ جس کے ظاہر و باطن اور فعل و قول میں اختلاف نہیں ہوتا ہے وہی امانت الٰہی کا ادا کرنے والا اور عبادتِ الٰہی میں مخلص ہوتا ہے۔"

(ii) ٹیکس اور خراج وصول کرنے میں عوام کے ساتھ زیادتی نہ کی جائے

امیر المؤمنین علیہ السلام عاملینِ زکوۃ کو عدل اور انصاف کا حکم دیتے ہیں:

" ولا تحشموا احداً عن حاجته ولا تحبسوه عن طلبته ۔۔۔ و لاتذّخروا انفسکم نصیحةً و لا الجند حسن سیرةٍ و لاالرعیّةَ معونة۔" (22)

یعنی: "کسی سے اس کی ضرورت کو قطع نہ کرو اور نہ ہی اس کے مقصد میں روڑے اٹکاؤ۔ لوگوں سے خراج وصول کرنے کے لیے ان سے گرمی و سردی کے کپڑوں اور مویشیوں کو جن سے وہ کام لیتے ہوں اور غلاموں کو فروخت نہ کرو۔ کسی کو پیسوں کی خاطر کوڑے نہ لگاؤ اور کسی مسلمان یا ذمی کے مال کو ہاتھ نہ لگاؤ، مگر یہ کہ اس کے پاس گھوڑا یا ہتھیار ہو کہ جو اہل اسلام کے خلاف استعمال ہونے والا ہو۔ اس لیے کہ یہ ایسی چیز ہے کہ کسی مسلمان کہ لیے مناسب نہیں کہ وہ اس کو دشمنانِ اسلام کے ہاتھوں میں رہنے دے کہ جو مسلمانوں پر غلبہ کا سبب بن جائے۔ آپس میں ہمیشہ خیر خواہی کرتے رہو، فوج سے نیک برتاؤ جاری رکھو اور عوام کی مدد کرتے رہو۔"

حضرت علی علیہ السلام ایک عامل زکوۃ کو ہدایت دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"انطلق علی تقویٰ اللہ وحدہٗ۔۔۔ لاتاخذنّ منہ اکثر من حقّ اللہِ۔" (23)

یعنی: "اللہ وحدہ لا شریک کا خوف دل میں لیے ہوئے نکل کھڑے ہو۔ کسی مسلمان کو خوفزدہ نہ کرنا، کسی پر اس طرح وارد نہ ہونا کہ اسے ناگوار گذرے۔ جتنا اس کے مال میں سے اللہ کا حق ہو اس سے زیادہ نہ لینا۔"

آپؑ عاملین زکوۃ کو اخلاقیات کا خاص خیال رکھنے کا حکم دیتے ہیں:

"فاِذا قدمت علی الحیّ فانزلْ بمائھم۔۔۔ لآخذ منکم حقّ اللہِ فی اموالکم۔" (24)

یعنی: "پس جب کسی قبیلے کی طرف جانا تو لوگوں کے گھروں میں گھسنے کے بجائے پہلے ان کے کنوؤں پر جا کر اترنا، پھر سکون اور وقار کے ساتھ ان کی طرف بڑھنا، یہاں تک کہ جب ان میں جا کر کھڑے ہو جاؤ تو ان پر سلام کرنا اور آداب اور تسلیم میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھنا۔ ان سے کہنا اے اللہ کے بندو! مجھے اللہ کے ولی اور اس کے خلیفہ نے تمہارے پاس بھیجا ہے، اگر تمہارے پاس مال میں سے اللہ کا کوئی حق نکلتا ہے تو اسے وصول کر لوں۔"

نیز آپ علیہ السلام اپنے نصائح میں نصیحت فرماتے ہیں کہ مالک کے اس اظہار کو کہ اس کے مال میں زکوۃ ہے یا نہیں ہے قبول کیا جائے:

"ھَلِ للہِ فی اموالکم فی حقٍّ فتؤدّوہ۔۔۔ ولا تفزعنّھا ولا تسوئنّ صاحبھا فیھا۔" (25)

یعنی: "کیا تمہارے مال میں اللہ کا کوئی واجب الادا حق ہے کہ جسے اللہ کے ولی تک پہنچاؤں؟ اگر کوئی کہنے والا کہے کہ نہیں تو پھر اس سے دہرا کہ نہ پوچھنا اور اگر کوئی کہنے والا ہاں کہے، تو اسے ڈرائے دھمکائے یا اس پر سختی و تشدد کئے بغیر اس کے ساتھ ہو لینا۔ اگر اس کے پاس گائے، بکری یا اونٹ ہوں تو ان کے غول میں اس کی اجازت کے بغیر داخل نہ ہونا، کیونکہ اس میں زیادہ حصہ تو اسی کا ہے۔ جب مالک داخل ہونے کی اجازت دے دے تو اس طرح داخل نہ ہونا کہ تمہیں اس پر پورا قابو حاصل ہے اور نہ اسی طرح کہ تمہیں اس پر تشدد کرنے کا حق حاصل ہے، کسی جانور کو نہ بھڑکانا، نہ ڈرانا اور نہ اس کے بارے میں اپنے غلط رویّہ سے مالک کو رنجیدہ کرنا۔"

(iii) مال کو مالک کی مرضی کے مطابق تقسیم کیا جائے

اس حوالے سے حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"واصدع المال صدعین ثمّ خیّروہ فاِذا اختارَ۔۔۔ ثمّ اصنع مثل الذی صنعت اوّلا حتّی تاخذ حقّ اللہ فی مالہٖ۔" (26)

یعنی: "مال کے دو حصہ کر دینا اور مالک کو اختیار دینا، جب وہ کوئی حصہ اختیار کرے، تو اس کے انتخاب سے تعرّض نہ کرنا۔ پھر بقیہ حصہ کے دو حصہ کر دینا اور اسے اختیار دینا، اور جب وہ کوئی حصہ انتخاب کر لے، تو اس سے تعرض نہ کرنا۔ اس طرح کرتے رہنا یہاں تک اختیار دینا، اور جب وہ کوئی حصہ انتخاب کر لے تو اس سے تعرض نہ کرنا۔ اس طرح کرتے رہنا یہاں تک کہ بس اتنا رہ جائے کہ جتنے سے اس مال میں جو اللہ کا حق ہے، وہ پورا ہو جائے، تو بس اسے اپنے قبضے میں لے لینا۔ اگر وہ دوبارہ تقسیمِ مال کا مطالبہ کرے، تو اس کے مطالبے کو قبول کرنا، پھر سارے مال کو آپس میں خلط ملط کر دینا، پھر اسی طرح تقسیم کرنا، جس طرح پہلے تم نے تقسیم کیا تھا، یہاں تک کہ اس کے مال سے اللہ کا حق لے لو۔"

۷۔ بیت المال کی تقسیم

(i) تقسیم کا طریقہ کار

حضرت امیر المؤمنین علی ابن طالب علیہ السلام نے جب ظاہری خلافت کو اپنے ہاتھوں میں سنبھالا، تو بیت المال کی تقسیم میں پیغمبر اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے مطابق جس شہر میں جو مال جمع ہوتا اسی شہر کے مستحقین میں تقسیم کر دیتے۔ اگر وہاں سے کچھ بچ کر آپؑ کے پاس آتا، تو بیت مال میں سمیٹ رکھنے کے بجائے اسے مستحقین میں تقسیم کر کے بیت المال خالی کر دیتے تھے: "ما کان یدع فی بیت المال مالا یبیت فیہ حتی یقسمہ الا ان یشغلہ شغل فیصبح الیہ" یعنی: "آپؑ نے یہ نوبت نہیں آنے دی کہ رات گزاریں اور مال بیت المال میں پڑا رہے بلکہ رات سے پہلے اسے تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ البتہ اگر کوئی مانع ہوتا تو صبح ہونے دیتے۔ (27)

بیت المال کی تقسیم کی تفصیل قرآن مجید اور حدیث نبوی (ص) میں موجود ہے اور اسی کی روشنی میں حضرت علی علیہ السلام بیت المال کی تقسیم کے بارے میں ایک عامل زکوۃ کو یوں لکھتے ہیں:

"و انّ لك فی هٰذه الصدقة نصیباً مفروضاً ۔۔۔ والمساکین والسّائلون و لمرفوعونوالغارم وابن السبیل۔" (28)

یعنی: "بے شک اس زکوۃ میں تمہارا بھی معین حصہ اور جانا پہچانا حق ہے۔ اور اس میں بیچارے مسکین اور فاقہ کش لوگ بھی تمہارے شریک ہیں، اور ہم تمہارا حق پورا پورا ادا کرتے ہیں، تو تم بھی ان کا حق پورا پورا ادا کرو، اگر تو نے حق ادا نہ کیا تو یاد رکھو کہ روزِ قیامت تمہارے ہی دشمن سب سے زیادہ ہوں گے۔ وائے بد بختی اس شخص کی جس کے خلاف اللہ کے حضور فریق بن کر کھڑے ہونے والے فقیر، نادار، سائل، دھتکارے ہوئے لوگ، قرضدار اور مسافر ہوں۔"

اسی طرح مصارف زکوۃ قرآن کریم میں بھی بیان ہوئے ہیں:

"إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِنَ اللهِ وَاللهُ عَلِيمٌ حَكِيم " **(29)**

یعنی: " بیشک زکوۃ فقراء، مساکین، زکوۃ جمع کرنے والے، مؤلفۃ القلوب، غلام آزاد کرنے کے لیے، قرضدار اور مسافر کے لیے ہے۔ اور یہ ایک اہم خدائی فریضہ ہے اور اللہ دانا و حکیم ہے۔"

امامؑ، بیت المال اللہ اور اس کے رسول صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق تقسیم کرنے کا حکم دیتے ہیں:

"ثمّ احدر الینا ما جتمع عندك نصیّرهٗ حیث امر الله به۔۔۔ لنقسمه علی کتاب الله وسنّةِ نبیّهٖ صلّی الله علیه وآله وسلّم۔" (30)

یعنی: " پھر جو کچھ تمہارے پاس جمع ہوا ہے اسے جلد سے جلد ہماری طرف بھیجتے رہنا تاکہ ہم جہاں جہاں اللہ کا حکم ہے وہاں صرف کریں تاکہ ہم اس مال کو اللہ کی کتاب اور اس کے نبی صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی سنت کے مطابق تقسیم کریں۔"

یہاں سے یہ امر واضح ہوتا ہے، کہ بیت المال کی تقسیم میں اللہ تعالی اور اس کے رسول صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتائے اصولوں کا خیال رکھنا ضروری ہے اور حضرت علی علیہ السلام ان کی پابندی کا پورا پورا خیال رکھتے تھے اور سختی سے اس پر عمل بھی کرتے تھے۔

(ii) بیت المال میں سب برابر کے شریک ہیں

حکومتی خزانے بیت المال میں جمع ہونے والے مال میں تمام مسلمان برابر کے شریک ہیں کیونکہ یہ مال اللہ تعالیٰ کا مال ہے اور تمام انسان اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، لہٰذا ان میں برابر تقسیم کیا جائے گا۔ حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"انّ ھٰذا المال لیس لی ولا لك ۔۔۔ لاتکون لغیرا فواھھم۔" (31)

یعنی: "یہ مال نہ میرا ہے نہ تمہارا بلکہ مسلمانوں کا حقِ مشترک ہے اور ان کی تلواروں کا جمع کیا ہوا سرمایہ ہے۔ اگر تم ان کے ساتھ جنگ میں شریک ہوئے ہوتے تو تمہارا حصہ بھی ان کے برابر ہوتا ورنہ ان کے ہاتھوں کی کمائی دوسروں کے منہ کا نوالہ بننے کے لیے نہیں ہے۔"

یہ ہے ہادی برحق امام المتقین علی علیہ السلام کی روش، کہ کتنا ہی قریبی دوست اور حمایتی ہی کیوں نہ ہو، اس کو بیت المال میں سے، جس میں تمام مسلمانوں بلکہ انسانوں کا حق مشترک ہے، کچھ دینے کے بجائے عدل کو قائم رکھتے ہوئے اس مال کو تمام لوگوں میں برابر تقسیم کرتے ہیں۔

(iii) تقسیم بیت المال میں مساوات اور عدل

امیر المؤمنین علیہ السلام نے بیت المال کی تقسیم میں اعلیٰ اور ادنی، قرشی اور غیر قرشی، آزاد اور غلام سب کا حق مساوی سمجھتے تھے۔ اور رنگ و نسل اور قومیت و وطنیت کی بنا پر امتیاز گوارا نہ کرتے تھے اور یہ اعلان کر دیا تھا کہ میں سب امتیازات ختم کر دوں گا۔ آپ (ع) کے بھائی حضرت عقیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ اعلان سنا، تو آپؑ سے کہا کہ آپؑ مجھے اور مدینہ کے ایک حبشی غلام کو ایک سطح پر رکھیں گے، تو حضرتؑ نے انہیں فرمایا:

"اجلس رحمك اللہ و ما فضلك علیہ الا بسابقۃ او تقوی۔" (32)

یعنی :" بیٹھئے خدا تم پر رحم کرے اگر تم کو اس پر فضیلت ہو سکتی ہے، تو سبقت اور تقویٰ کی بناپر (نہ کہ بیت المال کی تقسیم میں) ۔

ایک مرتبہ دو عورتیں حضرت امیر علیہ السلام کے پاس بیت المال میں سے اپنا حصہ لینے آئیں تو حضرتؑ نے ان دونوں کو برابر برابر دے دیا۔ اس پر ایک نے کہا میں عربیہ اور آزاد ہوں اور یہ غیر عربیہ اور کنیز ہے، آپؑ نے ہم دونوں کو ایک ہی درجہ پر سمجھ لیا، حالانکہ میں مرتبہ کے اعتبار سے بلند تر ہوں۔ حضرت نے زمین سے مٹی اٹھائی اور اس پر نظر کرنے بعد فرمایا:

"ما اعلم ان اللہ فضل احدا من الناس علی احد الا بالطاعۃ والتقوی۔"

یعنی: " میرے علم میں نہیں کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فوقیت دی ہو مگر اسے جو طاعت و تقویٰ میں بڑھا ہوا ہو۔"

یہاں سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی نگاہ میں تمام انسان برابر ہیں۔ ان میں بحثیت انسان کوئی فرق نہیں ہے، چاہے امیر ہو یا غریب، عرب ہو یا عجم، آقا ہو یا غلام۔ آپ (ع) نے اپنے بھائی کو اور ایک حبشی غلام کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا۔ ایک مرتبہ آپ (ع) کے صحابی سہل ابن حنیف اپنے حبشی غلام کو لے کر آپؑ کی خدمت میں آئے اور کہا کہ یہ بیت المال میں سے اپنا حصہ لینے کے لیے آیا ہے، آپ اسے کیا دیں گے۔ فرمایا کہ تمہیں کیا ملا ہے؟ کہا کہ سب کو تین تین دینار ملے ہیں۔ فرمایا کہ اسے بھی تین دینار دیئے جائیں گے۔

ایک مرتبہ آپ (ع) کی ہمشیرہ اُم ہانی بنت ابی طالب علیہ السلام آپؑ کے ہاں بیت المال میں سے اپنا حصہ لینے آئیں، تو آپؑ نے انہیں بیت المال میں سے بیس درہم دیئے۔ انہوں نے واپس پلٹ کر اپنی ایک عجمیہ کنیز سے دریافت کیا، کہ تمہیں امیر المؤمنین علیہ السلام نے کیا دیا ہے۔ اس نے کہا بیس درہم۔ یہ سن کر جناب ام ہانی حضرت کے پاس آئیں اور کہا کہ آپ نے جو کنیز کو دیا ہے وہی مجھے دیا ہے حالانکہ میرا حق فائق ہے۔ حضرت نے فرمایا :

"انی واللہ لا اجد لبنی اسمٰعیل فی ھٰذا الفئ فضلا علی بنی اسحٰق۔"

یعنی: " خدا کی قسم میں نے کہیں نہیں پایا کہ اس مال میں بنی اسماعیل کو بنی اسحاق پر کوئی فوقیت حاصل ہے۔"

امیر المؤمنین کی بلند نفسی اس کی قطعاً روادار نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ قرابت و عزیز داری کی بناء پر تقسیم بیت المال کے بارے میں اپنے نظریئے میں تبدیلی پیدا کریں اور جانبداری سے کام لے کر اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے امتیازی برتاؤ روا رکھیں، خواہ بہن ہو یا بھائی بیٹا ہو یا بیٹی۔ آپؑ نے تقسیم بیت المال میں وہی طرز عمل اختیار کیا جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تھا۔ نہ بیت المال میں مال جمع کر رکھا اور نہ تقسیم میں رنگ و نسل کا امتیاز کیا، بلکہ عدل و مساوات کے جو پیمانے وضع کئے اور حق و انصاف کے جو معیاری نمونے پیش کئے دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

جب حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے آپ پر اعتراض کیا کہ آپ (ع) نے بیت المال کی تقسیم میں اتنی برابری اختیار کی ہوئی ہے کہ ہمیں بھی عوام کے عام افراد کے برابر کر دیا ہے تو آپ (ع) نے ان کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ:

"الا تخبرانی ایُّ شیئٍ لکما فیہ۔۔۔ وامضیٰ فیہ حکمہ۔" (33)

یعنی: " یہ تو بتاؤ کہ تمہارا کون سا حق تھا جو تمہیں نہیں دیا؟ اور کون سا حصہ تھا جس میں تم پر دوسروں کو ترجیح دی ہو۔۔ رہا یہ کہ میں نے تقسیم میں مساوات برتی ہے، تو یہ وہ کام ہے جس میں، میں نے اپنی رائے سے فیصلہ نہیں کیا ہے، نہ اپنی خواہش سے اسے جاری کیا ہے۔ بلکہ یہ وہی طے شدہ چیز ہے، جسے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم لے کر آئے جو میرے اور تمہارے سامنے ہے، تو جس چیز کی اللہ نے حد بندی کر دی ہے اور اس کا قطعی حکم دے دیا ہے، اس میں مجھے تم سے رائے لینے کی کو ضرورت نہیں۔"

حضرت علی علیہ السلام مصقلہ بن ہبیرہ شیبانی کو تنبیہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"الا وانّ مَن قِبَلك وقبلنا من المسلمین، فی قسمة ھٰذا الفیء سواءٌ یردون عندی علیہ۔" (34)

یعنی: " دیکھو! وہ مسلمان جو میرے اور تمہارے پاس ہیں، اس مال کی تقسیم میں برابر کے حصّہ دار ہیں، اسی اصول پر وہ اس مال کو لینے کے لیے میرے پاس آتے ہیں اور لے کر چلے جاتے ہیں۔"

(iv) بیت المال میں غریبوں ناداروں اور مسکینوں کا حق ہے

حضرت علی علیہ السلام اپنے گورنر مالک اشتر کو بے سہارا، مساکین اور فقراء کے حقوق کے بارے میں ہدایات دیتے ہیں:

"اللہ اللہ فی الطبقہ السفلیٰ من الذین لا حیلۃ لھم ۔۔۔ و تفقّد امور من لایصل الیك منھم ممّن تفتحمہ العیون و تحقرہ الرّجال۔" (35)

یعنی: " خصوصیت کے ساتھ اللہ کا خوف کرنا، پس ماندہ طبقہ کے بارے میں جن کا کوئی سہارا نہیں ہوتا، وہ مسکینوں، محتاجوں، فقیروں اور معذوروں کا طبقہ ہے۔ ان میں کچھ تو ہاتھ پھیلا کر مانگنے والے ہوتے ہیں اور کچھ کی صورت ہی سوال ہوتی ہے۔ اور اللہ کی خاطر ان بے کسوں کے بارے میں ان کے اس حق کی حفاظت کرنا، جس کا اللہ نے تمہیں ذمہ دار بنایا ہے۔ ان کے لیے ایک حصہ بیت المال سے معین کر دینا اور ایک حصہ شہر کے اس غلہ میں سے دینا جو اسلامی غنیمت کی زمینوں سے حاصل ہوا ہو، کیونکہ اس میں دور والوں کا اتنا ہی حصہ ہے جتنا نزدیک والوں کا ہے۔ اور تم ان سب کے حقوق کی نگہداشت کے ذمہ دار بنائے گئے ہو۔ لہٰذا تمہیں دولت کی سرمستی کہیں غافل نہ کر دے۔ پس کسی معمولی بات کو اس لیے نظر انداز نہیں کیا جائے گا کہ تم نے بہت سے اہم کاموں کو پورا کر دیا ہے۔ لہٰذا اپنی توجہ ان سے نہ ہٹانا۔ نہ تکبر کے ساتھ ان کی طرف سے اپنا رخ پھیر لینا اور نہ ہی اپنی توجہ ان سے ہٹانا۔ خصوصیت کے ساتھ خبر رکھو ایسے افراد کی جو تم تک پہنچ نہ سکتے ہوں، جنہیں آنکھیں دیکھنے سے کراہت کرتی ہونگی اور لوگ انہیں حقارت سے ٹھکراتے ہوں گے۔"

(۷) بیت المال میں یتیموں اور بوڑھوں کے حقوق

حکومت کی ذمہ داری ہے کہ عوام میں سے جو یتیم ہیں یا یتیموں کی پرورش کرنے والے ہیں اور جو بہت ہی بوڑھے ہو چکے ہیں ان کے حقوق کا خاص خیال رکھے۔ حضرت علی علیہ السلام اپنے گورنر کو ایسے لوگوں کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیتے ہیں:

" و تعھّدْ اھل الیُتمِ و ذوی الرِّقّۃِ ۔۔۔ وَوَثِقوا بصدق موعودِ اللہِ لھمْ۔ (36)

یعنی: " یتیموں اور یتیموں کے پالنے والوں کا بھی خیال رکھنا ہو گا، اور ان کا بھی جو بہت بوڑھے ہو چکے ہیں، جن کا کوئی سہارا نہیں، جو بھیک مانگنے کے بھی لائق نہیں رہے۔ اور یہی وہ کام ہے جو حکام پر گراں

گذرتا ہے، جبکہ حق سارے کا سارا بھاری ہوتا ہے۔ ہاں خدا ان لوگوں کے لیے جو آخرت کے طلبگار ہوتے ہیں، ان کی گرانیوں کو ہلکا کر دیتا ہے۔ وہ اسے اپنی ذات پر جھیل لے جاتے ہیں اور اللہ نے جو، ان سے وعدہ کیا ہے اس کی سچائی پر بھروسہ کرتے ہیں۔

(vi) تقسیم بیت المال میں اپنے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ بھی عدل سے پیش آنا

امام علی علیہ السلام اپنے بھائی حضرت عقیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ، جو آپؑ کے پاس آئے اور بیت المال سے زیادہ حصہ کا مطالبہ کیا، تو آپؑ نے اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

"واللہِ لقد رأیتُ عقیلا و قد املق ۔۔۔ فاَصغیتُ الیه سمعی فظنّ انّی ابیعه دینی و اتّبع قیادہ مفارقاً طریقی۔" (37)

یعنی: " اللہ کی قسم میں نے عقیل کو سخت فقر و فاقہ کی حالت میں دیکھا، یہاں تک کہ وہ تمہارے حصہ کے گیہوں میں سے ایک صاع مجھ سے مانگتے تھے۔ میں نے ان کے بچوں کو بھی دیکھا جن کے بال بکھرے ہوئے تھے اور فقر و بے نوائی سے رنگ تیرگی مائل ہو چکے تھے گویا ان کے چہرے نیل چھڑک کر سیاہ کر دیے گئے ہیں۔ وہ اصرار کرتے ہوئے میرے پاس آئے اور اس بات کو بار بار دہرایا، میں نے ان کی باتوں کو کان لگا کر سنا تو انہوں نے یہ خیال کیا کہ میں ان کے ہاتھوں اپنا دین بیچ ڈالوں گا اور اپنی روش چھوڑ کر ان کی کھینچ تان پر ان کے پیچھے ہو جاؤں گا۔

جب حضرت عقیل رضی اللہ تعالی عنہ کا اصرار بڑھا تو آپ (ع) نے انہیں عبرت اور نصیحت سکھانے کے طریقہ کی وضاحت یوں کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فاحمیتُ له حدیدۃً ثمّ اذنیتها ۔۔۔ من الاذی و لا ائنُّ من لظی۔" (38)

یعنی: " مگر میں نے کیا یہ کہ ایک لوہے کے ٹکڑے کو تپایا اور پھر ان کے جسم کے قریب لے گیا تاکہ عبرت حاصل کرے، چنانچہ وہ اس طرح چیخے جس طرح کوئی بیمار درد اور کرب سے چیختا ہے اور قریب تھا کہ ان کا جسم اس داغ دینے سے جل جائے۔ پھر میں نے ان سے کہا اے عقیل رونے والیاں تم پر روئیں کیا تم اس لوہے کے ٹکڑے سے چیخ اٹھے ہو، جسے ایک انسان نے ہنسی مذاق میں تپایا ہے اور تم مجھے

اس آگ کی طرف کھینچ رہے ہو کہ جسے خدائے قہار نے اپنے غضب سے بھڑکایا ہے تم تو اذیت سے چیخو اور میں جہنم کے شعلوں سے نہ چلاؤں۔"

امام علی علیہ السلام اپنے ایک عامل کو، کہ جو آپؑ کے رشتہ داروں میں سے تھا، اس نے بیت المال میں خیانت کی تھی، سرزنش کرتے ہوئے اسے لکھتے ہیں:

" فاتق و اردد الی هؤلاء القوم اموالهم۔۔۔ حتّی آخذ الحقّ منها و ازیح الباطل عن مظلمتها۔"(39)

یعنی: " خدا سے ڈرو اور ان لوگوں کے اموال واپس کر دو۔ اگر ایسا نہ کروگے اور خدا نے کبھی مجھے تم پر اختیار دے دیا، تو تمہارے بارے میں وہ فیصلہ کروں گا، جو مجھے معذور بنا سکے تمہارا خاتمہ اسی تلوار سے کروں گا، جس کے مارے ہوئے کا ٹھکانہ جہنم کے علاوہ نہیں ہے۔ اللہ کی قسم اگر حسن اور حسین (علیہما السلام) بھی وہ کرتے، جو آپ نے کیا ہے، تو میں ان سے بھی کوئی رعایت نہ کرتا اور نہ مجھ سے کوئی اپنی خواہش منوا سکتے، یہاں تک کہ میں ان سے حق کو واپس لے لیتا اور ان کے ظلم سے پیدا ہونے والے غلط نتائج کو مٹا دیتا۔"

آپؑ اپنے ایک رشتہ دار گورنر سے لوٹے ہوئے بیت المال کو واپس کرنے کا حکم دیتے ہیں:

" و اقسم بالله ربّ العٰلمین ما یسرّنی۔۔۔ ینادِی الظالمُ فیه بالحسرة و یتمنّی المضیّع الرّجعة و لات حین مناصٍ۔" (40)

یعنی: " میں رب العالمین کی قسم کھاتا ہوں، کہ یہ میرے لیے خوش ہونے والی بات نہ تھی، کہ وہ مال جو تم نے ہتھیا لیا ہے، میرے لیے حلال ہوتا، اور میں اسے بعد والوں کے لیے بطور ترکہ چھوڑ جاتا۔ ذرا سنبھلو اور سمجھو کہ تم عمر کی آخری حد تک پہنچ چکے ہو اور مٹی کے نیچے سونپ دیئے گئے ہو، اور تمہارے تمام اعمال تمہارے سامنے پیش ہیں۔ اس مقام پر ظالم جہاں واحسرتا کی صدا بلند کرتا ہوگا، اور عمر کو برباد کرنے والے دنیا کی طرف پلٹنے کی آرزو کر رہے ہوں گے، حالانکہ اب گریز کا کوئی موقع نہ ہوگا۔"

یہ ہے امیر المؤمنین امام المتقینؑ کا طرز عمل کے اپنے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ بھی وہی سلوک کرتے ہیں، جو دوسروں سے کرتے ہیں۔ کسی کو کسی پر کوئی ترجیح اور فوقیت نہیں دیتے۔ دشمن اور دوست، قریبی اور دور کے سب یکساں ہیں، ان کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔

۸۔ حضرت علی علیہ السلام کا اپنے گورنروں کو عدل اور انصاف قائم کرنے کا حکم

امام علی علیہ السلام اپنے خطبوں، خطوط اور اقوال میں اپنے تمام گورنروں کو عدل اور انصاف قائم کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ جب زیاد ابن ابیہ کو عبداللہ ابن عباس کی قائم مقامی میں فارس اور اس کے ملحقہ علاقوں کا گورنر مقرر کیا تو اسے یہ ارشاد فرمایا: " استَعمِلِ العدلَ واحْذَرِ العسفَ والحَيفَ؛ فإنَّ العسفَ يعدُ بالجلاءِ والحيفَ يدعو الى السّيف" یعنی: " عدل کی روش پر چلو بے راہ روی اور ظلم سے کنارہ کشی کرو، کیونکہ بے راہ روی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انہیں گھر بار چھوڑنا پڑے گا اور ظلم انہیں تلوار اٹھانے پر مجبور کرے گا۔" (41) ایک اور مقام پر اپنے گورنر مالک اشتر کو عدل و انصاف قائم رکھنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

"انصف الله وانصف النّاس من نفسك۔۔۔ حتّٰى ينزع او يتوب۔" (42)

یعنی: " اپنی ذات کے بارے میں اور اپنے خاص عزیزوں اور رعایا میں سے اپنے دل پسند افراد کے معاملے میں اللہ تعالیٰ اور انسانوں سے متعلق انصاف کرتے رہنا۔ پس اگر تم نے انصاف نہ کیا تو ظالم ٹھہروگے، اور جو خدا کے بندوں پر ظلم کرتا ہے، تو بندوں کے بجائے اللہ اس کا دشمن بن جاتا ہے۔ جس کا اللہ دشمن ہو، وہ اس کی ہر دلیل کو کچل دیتا ہے اور اللہ اس سے برسرپیکار رہے گا، یہاں تک کہ وہ بندہ ظلم سے باز آجائے اور توبہ کرلے۔"

۹۔ سماجی عدل

عدل اور انصاف کا ایک حصّہ اقتصادی انصاف اور مالی امور کے توازن کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ اسلام کی نگاہ میں دولت کے منابع اور مخازن اللہ تعالیٰ کے تمام بندوں کے لیے یکساں ہیں۔ جس کی وضاحت حضرت علی علیہ السلام یوں کرتے ہیں: " انتم عباد الله والمال مال الله يقسّم بينكم بالسويّةِ لا

فضل فیہ لاحد علی احد" یعنی: "تم اللہ کے بندے ہو اور یہ مال اللہ کا مال ہے جو تم میں برابر تقسیم کیا جائے گا اس میں کسی کو کسی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔" (43)

اسلامی حکومت اسے جمع کرنے، اس کی حفاظت کرنے اور تقسیم کرنے کی ذمہ دار ہے اس بنا پر حکومت عموماً اقتصادی مسائل میں چاہے وہ بیت المال سے متعلق ہوں یا عمومی اموال سے، منابع و معادن ہوں یا انفال و ٹیکس وغیرہ ہوں ایسی ذمہ داری رکھتی ہے، جو حکمرانی کی سیاست سے نہیں ہے۔ قرآن کریم میں اس سلسلہ میں اشارے موجود ہیں۔ ان میں سے حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ ہے کہ جب انہیں قید سے آزادی کی خوش خبری دی گئی اور بادشاہ مصر نے آپ (ع) کو کوئی عہدہ دینا چاہا تو آپ (ع) نے جواب میں فرمایا: "اِجۡعَلۡنِیۡ عَلٰی خَزَآئِنِ الۡاَرۡضِ اِنِّیۡ حَفِیۡظٌ عَلِیۡمٌ" یعنی: "زمین کے خزانوں کی ذمہ داری مجھے سونپ دے کہ میں امانت داری کے تحت نیز آمدنیوں کے مصارف اور منابع کے علم کی روشنی میں یہ فریضہ بخوبی ادا کرونگا۔" (44)

۱۰۔ مالیات دینے والوں کی مشکلات اور ٹیکس اور خراج میں کمی

مالیات دینے والے اگر کسی مشکل کی وجہ سے ٹیکس اور خراج کی گرانباری کی شکایت کریں، تو خراج کے وصول میں کمی کی جائے، نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

"فان شکوا ثقلا او علّۃً او انقطاع شربٍ۔۔۔ افضل قوّتھم بما ذخرت عندھم من اجمامك لھم۔" (45)

یعنی: "اگر عوام خراج کی گرانباری، یا کسی ناگہانی آفت کی، یا نہری اور بارانی علاقوں میں ذرائع آب پاشی کے ختم ہونے، یا زمین کے سیلاب میں گھر جانے، یا سیرابی کے نہ ہونے کے باعث، اس کے تباہ ہونے کی شکایت کریں، تو خراج میں اتنی کمی کر دو جس سے تمہیں ان کے حالات کے سدھرنے کی توقع ہو۔ اور ان کے اس بوجھ کو ہلکا کرنے سے تمہیں گرانی محسوس نہ ہو، کیونکہ انہیں زیر باری سے بچانا ایک ایسا ذخیرہ ہے، کہ جو تمہارے ملک کی آبادی اور تمہارے قلمرو حکومت کی زیب و زینت کی صورت میں تمہیں پلٹا دیں گے۔ اور اس کے ساتھ تم ان سے خراجِ تحسین اور عدل قائم کرنے کی وجہ سے مسرّت بے

پایاں بھی حاصل کر سکوگے، اپنے اس حسنِ سلوک کی وجہ سے کہ جسے تم نے ذخیرہ کرکے ان کے پاس رکھ دیا ہے۔"

حکومت کے اس رحمدلی اور شفقت آمیز رویہ کی وجہ سے جب بھی اسے مشکل پیش آئے گی، تو اس وقت عوام بھی حکومت کی دل کھول کر مدد کرے گی:

"والثقة منهم بما عوّدتهم من عدلك۔۔۔ سؤ ظنّهم بالبقاء و قلّة انتفاعهم بالعبرِ۔" (46)

یعنی: " اور تم ان کی قوت کے بل بوتے پر بھروسہ کر سکوگے اور رحم کے جلو میں، جس سیرتِ عادلانہ کا تم نے انہیں خوگر بنایا ہے اس کے سبب سے، تمہیں ان پر اعتماد ہو سکے گا، اس کے بعد ممکن ہے کہ ایسے حالات بھی پیش آئیں کہ جن میں تمہیں ان پر اعتماد کرنے کی ضرورت ہو تو وہ انہیں بطیّب خاطر جھیل لے جائیں گے۔ کیونکہ ملک آباد ہے تو جیسا بوجھ اس پر لادوگے، وہ اٹھالے گا۔ اور زمین کی تباہی تو اس سے آتی ہے کہ کاشتکاروں کے ہاتھ تنگ ہو جائیں۔ اور ان کی تنگ دستی اسی وجہ سے ہوتی ہے کہ حکام مال اور دولت کے سمیٹنے پر تل جاتے ہیں اور انہیں اپنے اقتدار کے ختم ہونے کا کھٹکا لگا رہتا ہے اور عبرتوں سے بہت کم فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔

۱۱۔ حضرت علی علیہ السلام کا عاملین زکوۃ اور گورنروں سے حساب لینا

حضرت علی علیہ السلام اپنے کچھ عاملین زکوۃ کو خطاب کرتے ہیں:

" امّا بعدُ فقد بلغنی عنك امرٌ۔۔۔ فارفع الیّ حسابك واعلمْ انّ حساب الله اعظم من حساب النّاس۔" (47)

یعنی: " مجھے تمہارے متعلق ایک ایسے امر کی اطلاع ملی ہے کہ اگر تم اس کے مرتکب ہوئے ہو تو تم نے اپنے پروردگار کو ناراض کیا، اور امام کی نافرمانی کی اور اپنی امانتداری کو بھی رسوا کیا مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے زمین کو صفاچٹ کر میدان کر دیا ہے، اور جو کچھ تمہارے پاؤں تلے تھا اس پر قبضہ جما لیا ہے اور جو کچھ تمہارے ہاتھوں میں تھا اسے نوش جان کر لیا ہے تو تم ذرا اپنا حساب مجھے بھیج دو اور یقین رکھو کہ انسانوں کے حساب سے اللہ کا حساب کہیں زیادہ سخت ہوگا۔"

حضرت علی علیہ السلام اپنے گورنر اشعث ابن قیس کو تنبیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"و ان عملك ليس لك بطعمة ۔۔۔ حتّى تَسَلّمهُ اليّ و لعلى الّا اكون شرّ ولاتك لك۔" (48)

یعنی : " یہ تمہارا منصب کوئی لقمہ تر نہیں ہے، بلکہ تمہاری گردن میں ایک امانت الٰہی ہے اور تم ایک بلند ہستی کے زیر نگرانی حفاظت پر مامور ہو۔ تمہیں رعایا کے معاملے میں اس طرح کے اقدام کا حق نہیں ہے۔ اور خبردار کسی مستحکم دلیل کے بغیر کسی بڑے کام میں ہاتھ مت ڈالنا۔ اور تمہارے ہاتھوں میں خدائے بزرگ و برتر کے اموال میں سے ایک مال ہے اور تم اس وقت تک اس کے خزانچی ہو جب تک میرے حوالے نہ کردو بہرحال میں غالباً تمہارے لیے برا حکمران تو نہیں ہوں۔

اپنے ایک اور گورنر مصقلہ کو تنبیہ کرتے ہیں کہ :

"بلغنى عنك امرٌان كنت فعلته فقد اسخطت الٰهك ۔۔۔ و لاتصلح دنياك بمحق دينك فتكون من الاَخسرينَ اعمالا۔" (49)

یعنی : " مجھے تمارے متعلق ایک ایسے امر کی خبر ملی ہے جو اگر تم نے کیا ہے تو اپنے خدا کو ناراض کیا ہے، اور اپنے امام کو غضبناک کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اس مال غنیمت کو کہ جسے ان کے نیزوں اور گھوڑوں نے جمع کیا تھا اور جس پر ان کا خون بہایا گیا تھا، تم اپنی قوم کے بدؤں میں بانٹ رہے ہو جو تمارے ہوا خواہ ہیں۔ اس ذات کی قسم جس نے دانے کو چیرا اور جاندار چیزوں کو پیدا کیا ہے، اگر یہ صحیح ثابت ہوا، تو تم میری نظروں میں ذلیل ہو جاؤ گے اور تمہارا پلہ ہلکا ہو جائے گا۔ اپنے پروردگار کے حق کو سبک نہ سمجھو، اور دین کو بگاڑ کر دنیا کو نہ سنوارو۔ ورنہ عمل کے اعتبار سے خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوگے۔

۱۲۔ حکمران کی بیت المال پر نگرانی ضروری ہے

حضرت علی علیہ السلام اسلامی حکمران کی مختلف ذمہ داریوں کو بیان کرتے ہیں جن میں ایک اہم ذمہ داری مسلمانوں کے لیے بیت المال کی جمع آوری ہے، جس کی نگرانی حاکم ہی کرتا ہے، اس کے علاوہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔ اس بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

"و لاينبغى لى ان ادع الجند و المصر ۔۔۔ فى الجفير الفارغ۔" (50)

یعنی: " میرے لیے مناسب نہیں کہ میں لشکر، شہر، بیت المال، زمین کے خراج کی فراہمی، مسلمانوں کے مقدمات کا تصفیہ اور مطالبہ کرنے والوں کے حقوق کی دیکھ بھال چھوڑ دوں اور لشکر لیے ہوئے دوسرے لشکر کے پیچھے نکل کھڑا ہوں۔ اور جس طرح خالی ترکش میں بے پیکان کا تیر ہلتا جلتا ہے، جنبش کھاتا رہوں۔

اپنے ایک گورنر کو بیت المال کے متعلق کو ہدایت کرتے ہیں:

"و انظر الیٰ ما اجتمع عندك من مال الله۔۔۔ و ما فضل عن ذالك فاحمله الینا لنقسمه فی مَن قَبِلنا۔" (51)

یعنی: " تمہارے پاس اللہ کا جو مال جمع ہوا ہے، اسے اپنی طرف کے حاجتمندوں اور غریبوں پر خرچ کرو۔ اور فقر و فاقے اور ضرورتوں کے موقعوں کی تلاش کرو۔ اس سے جو کچھ بچ رہے، ہمارے پاس بھیج دو تاکہ ہم اپنی طرف والوں پر تقسیم کریں۔

امام علی علیہ السلام اپنے کارندوں کے تمام حرکات و سکنات اور رفتار و کردار، حتّٰی کہ معمولی مسائل پر بھی نگرانی کرتے تھے اور ان سے پوچھ گچھ کرتے تھے۔ جیسا کہ آپ نے والی بصرہ عثمان بن حنیف، کہ جو بصرہ کے ایک ایسے امیر فرد کی دعوت میں شریک ہوئے تھے، جس میں صرف امیر لوگ مدعو تھے اور غریب لوگوں کو کوئی دعوت نہیں تھی، کو فرمایا:

"امّا بعد یا ابن حنیف فقد بلغنی انّ رجلاً من۔۔۔ و ما ایقنْتَ بطیب وجوهٖ فَنَلْ منه۔" (52)

یعنی: " اے ابن حنیف! مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ بصرہ کے جوانوں میں سے ایک شخص نے تمہیں کھانے پر بلایا تو تم لپک کر پہنچ گئے کہ رنگا رنگ کے عمدہ عمدہ کھانے تمہارے لیے چن چن کر لائے جا رہے تھے، اور بڑے بڑے پیالے تمہاری طرف بڑھائے جا رہے تھے مجھے امید نہ تھی کہ تم ان لوگوں کی دعوت قبول کرلوگے کہ جن کے یہاں سے فقیر و نادار دھتکارے گئے ہوں، اور دولت مند مدعو ہوں، جو لقمے چباتے ہو، انہیں دیکھ لیا کرو، اور جس کے متعلق شبہ بھی ہو اسے چھوڑ دیا کرو اور جسے پاک و پاکیزہ طریق سے حاصل ہونے کا یقین نہ ہو اس میں سے کھاؤ۔

آپ (ع) اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے بعد اس اُمت پر آنے والے برے حالات کی فکر کرتے ہیں:

"و انّی الی لقاء اللہ لمشتاقٌ و حسن ثوابہٖ لمنتظرٌ راجٍ و لکنّنی آسی ان یلی امر ھٰذہٖ الامّۃِ سفھاؤھا و فجارُھا فیتّخذوا مال اللہ دوَلاً۔" (53)

یعنی: " اور یقینا میں اللہ کے حضور پہنچنے کا زیادہ مشتاق ہوں اور اس کے حسن ثواب کے لیے دامن امید پھیلائے ہوئے منتظر ہوں مگر مجھے اس کی فکر ہے کہ اس قوم پر حکومت کریں بد مغز پاگل اور بد کردار لوگ جو اللہ کے مال کو اپنی املاک بنائیں۔"

۱۳۔ حضرت علیؑ حکمرانوں کے لیے ایک بہترین نمونہ عمل

حضرت علی علیہ السلام کا ایک دوست علاء ابن زیاد بصرہ میں رہتا تھا، جب وہ بیمار ہوا، تو آپ (ع) اس کی عیادت کے لیے گئے، تو علاء نے آپ (ع) کو اپنے بھائی کی شکایت کی، کہ اس نے تو بالوں کی چادر اوڑھ لی ہے اور دنیا سے بالکل بے لگاؤ ہو گیا ہے۔ آپ (ع) نے اس کو سمجھایا تو اس پر اس شخص نے کہا:

" یا امیر المؤمنین ھٰذا انت فی خشونۃ ۔۔۔ ان یقدّروا انفسھم بضعفۃ النّاس کیلا یتبیّغ بالفقیرِ فقرہٗ۔" (54)

یعنی: " یا امیر المؤمنین! آپؑ کا پہناوا بھی تو موٹا جھوٹا ہوتا ہے اور کھانا روکھا سوکھا ہے۔ (اس کے جواب میں حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا) تم پر حیف ہے میں تمہاری طرح نہیں ہوں؛ اللہ نے عادل اماموں پر فرض کیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مفلس و نادار لوگوں کی سطح پر رکھیں تاکہ فقیر لوگ اپنے فقر کی وجہ سے پیچ و تاب نہ کھائیں۔"

آپ (ع) نے اپنے گورنر عثمان بن حنیف کو تنبیہ کرنے کے بعد انہیں اپنی حالت و کیفیت کے بارے میں بتاتے ہیں کہ:

"الا انّ لکلّ مأمومٍ اماماً یقتدِی بہ و یستضیئُ بنور علمہٖ۔۔۔ وحولی بطونٌ غرثی و اکباد حرّی۔" (55)

یعنی: " تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہر مقتدی کا ایک امام ہوتا ہے، جس کی وہ پیروی کرتا ہے، اور جس کے نور علم سے روشنی حاصل کرتا ہے۔ دیکھو! تمہارے امام کی حالت تو یہ ہے کہ اس نے دنیا کے ساز و سامان میں سے دو چادروں اور کھانے میں سے دو روٹیوں پر قناعت کر لی ہے۔ خدا کی قسم میں نے

تمہاری دنیا سے سونا سمیٹ کر نہیں رکھا اور نہ اس کے مال و متاع میں سے انبار جمع کر رکھے ہیں، اور نہ ان کپڑوں کے بدلے میں کوئی اور کپڑے مہیا کیے ہیں۔۔۔ اگر میں چاہتا تو صاف ستھرے شہد، عمدہ گیہوں اور ریشم کے بنے ہوئے کپڑوں کے لیے ذرائع مہیا کر سکتا تھا۔ ایسا کہاں ہو سکتا ہے کہ خواہشیں مجھے مغلوب بنالیں اور حرص مجھے اچھے اچھے کھانوں کے چن لینے کی دعوت دے۔ حجاز و یمامہ میں شاید ایسے بھی لوگ ہوں کہ جنہیں ایک روٹی کے ملنے کی بھی آس نہ ہو، اور انہیں پیٹ بھر کھانا کبھی نصیب نہ ہوا ہو۔ کیا میں اپنا پیٹ بھر کر سو یا رہوں اس حالت میں کہ میرے گرد بھوکے اور پیاسے جگر تڑپتے ہوں۔"

مزید اپنے بارے میں فرماتے ہیں:

"أأقنعُ من نفسی بان یقال امیر المؤمنین۔۔۔ تکترشُ من اعلافها و تلهوعمّا یرادُ بها۔" (56)

یعنی: "کیا میں اسی میں مگن رہوں کہ مجھے امیر المؤمنین کہا جاتا ہے؟ مگر میں زمانے کی سختیوں میں مؤمنوں کا شریک نہ بنوں۔ اور زندگی کی بدمزگیوں میں ان کے لیے نمونہ نہ بنوں۔ میں اس لیے تو پیدا نہیں ہوا ہوں کہ اچھے اچھے کھانوں کی فکر میں لگا رہوں۔ اس بندھے ہوئے چوپایہ کی طرح جسے صرف اپنے چارے ہی کی فکر لگی رہتی ہے۔ یا اس کھلے ہوئے جانور کی طرح کہ جس کا کام منہ مارنا ہوتا ہے، وہ گھاس سے پیٹ بھر لیتا ہے اور جو اس سے مقصد پیش نظر ہوتا ہے اس سے غافل رہتا ہے۔"

حضرت علی علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور ظلم و تعدی کے بارے میں اپنا موقف بیان کرتے ہیں کہ: "واللهِ لو اعطیتُ الاقالیم السبعة بما تحت افلاکها علی ان اعصی الله فی نملةٍ اسلبها جلب شعیرةٍ ما فعلتُ" یعنی: "خدا کی قسم! اگر ہفت اقلیم جو آسماں کے نیچے ہیں مجھے دیئے جائیں اس بدلے میں، میں اللہ کی اتنی نافرمانی کروں کہ چیونٹی کے منہ سے جو کا چھلکا چھینوں تو بھی ہرگز نہیں کروں گا۔" (57)

۱۴۔ حاکم پر لازم ہے کہ لوٹے ہوئے خزانے کو واپس پلٹائے

امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی بیت المال کے حوالے سے ایک روش یہ بھی تھی کہ غصب کیے ہوئے مال کو واپس بیت المال میں لوٹاتے تھے:

" واللہ لو وجدتُہٗ قد تزوّج بہ النّساء وملك بہ الاماء لرددتہ فاِنّ فی العدل سعۃ و من ضاق علیہ العدل فالجورُ علیہ اضیق۔" (58)

یعنی: " خدا کی قسم! اگر مجھے ایسا مال بھی کہیں نظر آتا جو عورتوں کے مہر اور کنیزوں کی خریداری پر صرف کیا جا چکا ہو تو اسے بھی واپس پلٹا دیتا۔ چونکہ عدل کے تقاضوں کو پورا کرنے میں وسعت ہے اور جسے عدل کی صورت میں تنگی محسوس ہو اسے ظلم کی صورت میں اور زیادہ تنگی محسوس ہو گی۔"

چونکہ بیت المال عوام کا مال ہوتا ہے، جس میں تمام رعایا برابر کی شریک ہے، کسی حاکم کی ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ بلکہ اس کے پاس ایک امانت ہے، ایسا نہیں کہ وہ اسے اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرے اور جس کو چاہے عطا کرے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو وہ مال بیت المال میں واپس کرنا عین عدل کے تقاضوں کے مطابق ہے۔

۱۵۔ بیت المال میں خیانت کرنے کے نتائج

امام علی علیہ السلام عاملین زکوۃ اور گورنروں کو ہدایت و نصیحت کرتے ہیں اور انہیں بیت المال میں خیانت کرنے کے نتائج سے آگاہ کرتے ہیں کہ:

"ومَن استَھانَ بالامانۃِ و رتعَ فِی الخِیانۃِ ۔۔۔ انّ اعظم الخیانۃ خیانۃ الامّۃِ وافظع الغشّ غشُّ الائمّۃ۔" (59)

یعنی: " جو شخص امانت کو بے وقعت سمجھتے ہوئے اسے ٹھکرا دے اور خیانت کی چراگاہوں میں چرتا پھرے اور اپنے آپ کو اور اپنے دین کو اس کی آلودگی سے نہ بچائے، تو اس دنیا میں بھی اپنے آپ کو ذلتوں اور خواریوں میں ڈالا اور آخرت میں بھی رسوا و ذلیل ہو گا۔ (اور تم جان لو کہ) بے شک سب سے بڑی خیانت اُمت کی خیانت ہے اور سب سے بڑی فریب کاری اپنے اماموں سے فریب کرنا ہے۔"

بیت المال کو صحیح مقام پر تقسیم نہ کرنے کے نتائج سے اپنے عاملین زکوۃ اور گورنروں کو آگاہ کرتے ہیں:

"انّما المال مال اللہ۔۔۔ وکان لغیرہ ودّھم۔" (60)

یعنی: ”بیشک یہ مال اللہ کا مال ہے، آگاہ رہو کہ ناحق کسی کو مال عطا کرنا تبذیر اور اسراف کہلاتا ہے۔ ناحق مال عطا کرنا مال عطا کرنے والے کو دنیا میں تو بلند کرتا ہے، لیکن آخرت میں پست کرتا ہے، اور لوگوں کے اندر عزت میں اضافہ کرتا ہے، مگر اللہ کے نزدیک ذلیل کرتا ہے۔ جو شخص بھی مال کو بغیر استحقاق کے یا نااہل افراد کو دے گا اللہ اسے ان کے شکریہ سے محروم ہی رکھے گا اور ان کی دوستی و محبت بھی دوسروں کے حصہ ہی میں جائے گی۔“

*****

حوالہ جات

1۔ نہج البلاغہ، جلد ۴: قول نمبر ۳۲۸، ص ۸۷

2۔ نہج البلاغہ، ج ۴، قول نمبر ۲۷۰، ص ۶۵

3۔ سورہ نساء: ۳۲

4۔ سورہ نساء: ۷

5۔ سورہ حشر: ۶

6۔ الانفال: ۴۱

7۔ سورہ نور: ۵۶

8۔ نہج البلاغہ، ج ۲، خطبہ ۱۱۰، ص ۲۱۵

9۔ نہج البلاغہ، ج ۲، خطبہ ۱۹۹، ص ۱۷۹

10۔ نہج البلاغہ، ج ۴، قول ۱۴۶، ص ۳۵

11۔ سورہ توبہ: ۱۰۳

12۔ نہج البلاغہ، ج ۳، مکوتب ۵۳، ص ۹۶

13۔ نہج البلاغہ، ج ۳، مکوتب ۵۳، ص ۹۶

14۔ نہج البلاغہ، ج ۳، مکوتب ۵۳، ص ۹۹

15۔ایضاً ص ۱۰۰
16۔ایضاً ص ۸۹۔۹۰
17۔ایضاً ص ۹۰
18۔ نہج البلاغہ، ج ۳، مکتوب ۳، ص ۹۶
19۔ایضاً
20۔ایضاً، ص ۹۰
21۔ایضا مکتوب ۲۶، ص ۲۶
22۔ نہج البلاغہ، ج ۳، مکتوب ۵۱، ص ۸۰، ۸۱
23۔ نہج البلاغہ، ج ۳، مکتوب نمبر ۲۵، ص ۲۳
24۔ نہج البلاغہ، ج ۳، مکتوب نمبر ۲۵، ص ۲۳
25۔ نہج البلاغہ، ج ۳، مکتوب نمبر ۲۵، ص ۲۴
26۔ نہج البلاغہ، ج ۳، مکتوب نمبر ۲۵، ص ۲۴
27۔حیدر، الشیروانی، مناقب اہلبیتؑ ص ۲۱۹
28۔ نہج البلاغہ، ج ۳، مکتوب ۲۶، ص ۲۶، ۲۷
29۔سورہ توبہ: ۶۰
30۔ نہج البلاغہ، ج ۳، مکتوب ۲۵، ص ۲۵
31۔ نہج البلاغہ، ج ۲، خطبہ ۲۳۲، ص ۲۲۶
32۔الکافی، ج ۸، ص ۱۸۲
33۔ نہج البلاغہ، ج ۲، خطبہ ۲۰۵، ص ۱۸۴، ۱۸۵
34۔مکتوب ۴۳، ۶۸
35۔ نہج البلاغہ، جلد ۳، ص
36۔ نہج البلاغہ، جلد ۳، ص
37۔ نہج البلاغہ، ج ۲، خطبہ ۲۲۴، ص ۲۱۷

38۔ایضاً
39۔ نہج البلاغہ، ج ۳، مکتوب ۴۱، ص ۶۶، ۶۷
40۔ایضاً
41۔ نہج البلاغہ، ج ۴، قول ۴۷۶، ص ۱۰۹، ۱۱۰
42۔ نہج البلاغہ، ج ۳، مکتوب ۵۳، ص ۸۵
43۔شرح ابن ابی الحدید، ج ۷، ص ۳۷
44۔سورۃ یوسف: ۵۵
45۔مکتوب ۵۳، ص ۹۶۔۹۷
46۔ایضا ص ۹۷
47۔ نہج البلاغہ، ج ۳، مکتوب نمبر ۴۰، ص ۶۴، ۶۵
48۔ نہج البلاغہ، ج ۳، مکتوب نمبر ۵، ص ۶
49۔ نہج البلاغہ، ج ۳، مکتوب نمبر ۴۳، ص ۶۸
50۔ نہج البلاغہ، ج ۱، خطبہ ۱۹، ص ۲۳۲
51۔ نہج البلاغہ، ج ۳، مکتوب ۶۷، ص ۱۲۸
52۔ نہج البلاغہ، ج ۳، مکتوب نمبر ۴۵، ص ۷۰
53۔ نہج البلاغہ، ج ۳، مکتوب ۶۲، ص ۱۲۰
54۔ نہج البلاغہ، ج ۲، خطبہ ۹۰۲، ص ۱۸۸
55۔ نہج البلاغہ، ج ۳، مکتوب نمبر، ص ۷۰، ۷۲
56۔ نہج البلاغہ، ج ۳، مکتوب نمبر ۴۵، ص ۷۲
57۔ نہج البلاغہ، ج ۲، خطبہ ۲۲۴، ص ۲۱۸
58۔ خطبہ ۱۵، ص ۴۶
59۔مکتوب ۲۶، ص ۲۷
60۔ نہج البلاغہ، ج ۲، خطبہ ۱۲۶، ص ۷۔

غیبت گناہ کبیرہ ہے

سید مزمل حسین نقوی*

خلاصہ

اسلام نے انسان کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ خدا نے اسے زمین پر اپنا جانشین و خلیفہ قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کو اپنی خوبصورت ترین مخلوق قرار دیتا ہے۔ کائنات اس کیلئے مسخر کی ہے۔ اس انسان کی فطرت میں دو پہلو پائے جاتے ہیں۔ مثبت بھی اور منفی بھی۔ عقل بھی ہے اور جذبات بھی۔ کمال بھی اور پستی بھی۔ یہ کونسی چیز ہے جو اسے کبھی اتنا بلند کر دیتی ہے اور کبھی اتنا پست بنا دیتی ہے۔ یہ انسان کے اعمال ہیں، انہی اعمال کی بنا پر وہ خدا کے اتنا قریب ہو جاتا ہے اور اس کا مظہر کہلانے لگتا ہے۔

پس نیک اعمال خدا کے قرب کا اور برے اعمال اس سے دوری کا موجب بنتے ہیں۔ بعض گناہوں کی پروا نہیں کی جاتی حالانکہ وہ گناہان کبیرہ میں سے شمار ہوتے ہیں۔ انہی میں سے ایک گناہ غیبت بھی ہے۔ غیبت یعنی کسی کی پیٹھ پیچھے برائی کرنا۔ قرآن کے مطابق غیبت کرنا ایسے ہی ہے جیسے مردہ بھائی کا گوشت کھانا۔ رسول خدا (ص) فرماتے ہیں: جو دنیا میں اپنے بھائی کا گوشت کھاتا ہے تو قیامت کے دن اس کے سامنے مردہ لایا جائے گا اور اسے کہا جائے گا اس مردہ کو کھاؤ جس طرح اسے زندگی میں کھایا تھا۔ حدیث کے مطابق غیبت کرنے کی وجہ سے اعمال قبول نہیں ہوتے۔ نیکیاں ختم ہو جاتی ہیں۔

غیبت دو طرح کی ہو سکتی ہے، زبانی اور عملی، یعنی زبان سے یا اشارے کنائے سے۔ غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ جس کی غیبت کی ہے اس سے معافی مانگے۔ ہو سکتا ہے کہ شرمندگی ہو لیکن یہ شرمندگی آخرت کی شرمندگی اور عذاب سے بہتر ہے۔ بعض مقامات پر غیبت کرنا جائز ہے بلکہ بعض اوقات واجب ہو جاتا ہے۔ طلب انصاف کے لیے، برائیوں کی روک تھام کے لیے، شرعی مسئلہ پوچھنے کے لیے غیبت جائز ہے۔ اسی طرح اگر کوئی کسی کے ساتھ کاروبار کرنا چاہتا ہے یا رشتہ جوڑنا چاہتا ہے اور وہ کسی سے اس کے بارے میں پوچھتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ سب کچھ سچ سچ بتائے۔ اب اگر وہ اس کے عیوب چھپائے گا تو پھر گناہ گار ہے کیونکہ اس نے مشورہ مانگنے والے کے ساتھ خیانت کی ہے۔ نیز بدعت گذار کی غیبت کرنا جائز ہے۔ کھلے عام گناہ کرنے والے کی غیبت کرنا بھی جائز ہے۔

*۔ ڈائریکٹر نور الہدیٰ فاصلاتی نظام تعلیم، بھارہ کہو، اسلام آباد

اسلام نے انسان کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ جب خدا نے بنی نوع انسان کی تخلیق کا ارادہ کیا تو اپنی نورانی مخلوق یعنی ملائکہ سے فرمایا:

"اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً قَالُوۡۤا اَتَجۡعَلُ فِیۡہَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡہَا وَیَسۡفِکُ الدِّمَآءَ وَنَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِکَ وَ نُقَدِّسُ لَکَ قَالَ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَالَا تَعۡلَمُوۡنَ" (1)

یعنی: "میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں تو انھوں نے کہا کہ تو ایسے کو خلیفہ بنائے گا جو زمین میں فساد پیدا کرے گا اور خون بہائے گا جبکہ ہم تیری حمد اور تقدیس کرتے ہیں۔ فرمایا جو اسرار خلقت میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔"

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان خدا کا جانشین ہے اور جب انسان کے مراحل تخلیق کو بیان کیا تو فرمایا یہ پانی تھا اس پانی سے خون بنا۔ خون سے لوتھڑا بنا، لوتھڑے سے ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ یہاں تک انسان اور حیوان کی خلقت ایک جیسی ہے، لیکن اس کے آگے فرمایا: "اَنۡشَاۡنٰہُ خَلۡقًا آخَرَ فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحۡسَنُ الۡخَالِقِیۡنَ" یعنی: "ہم نے اسے ایک اور ہی مخلوق بنا دیا۔ بابرکت ہے وہ ذات جس کی تخلیق اتنی خوبصورت ہے۔" (2)

انسان کی مزید فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"وَ لَقَدۡ کَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ وَ حَمَلۡنٰہُمۡ فِی الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ وَ رَزَقۡنٰہُمۡ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَ فَضَّلۡنٰہُمۡ عَلٰی کَثِیۡرٍ مِّمَّنۡ خَلَقۡنَا تَفۡضِیۡلًا" (3)

یعنی: "اور ہم نے اولاد آدم کو قابل احترام قرار دیا۔ اسے خشکیوں اور دریاؤں پر مسلط کیا۔ اسے پاکیزہ رزق عطا کیا اور اسے اپنی کثیر مخلوق پر فضیلت دی۔"

حضرت آدم (ع) جب زمین پر آرہے تھے تو خدا نے فرمایا اے آدم اگر میں تجھ سے کچھ مانگوں تو دوگے۔ عرض کیا پروردگار تو خالق ہے میں مخلوق ہوں۔ تو پروردگار ہے اور میں تیرا بندہ ہوں۔ تو ہی مجھے عطا کرتا ہے۔ فرمایا اے آدمؑ اگر کبھی کھانا مانگوں تو دوگے۔ عرض کیا پروردگار میں تیرا محتاج ہوں تو تو کھانے سے بے نیاز ہے کہا اچھا اگر کبھی لباس مانگوں تو دے گا۔ عرض کیا پروردگار میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ فرمایا اے آدم اگر کبھی تیرے دروازے پر میرا کوئی بندہ تجھ سے کچھ مانگنے آئے تو یوں سمجھنا کہ میں آیا

ہوں۔ خدا نے انسان کو اتنی اہمیت دی ہے کہ اپنے ساتھ ملا دیا ہے۔ انسان کا اتنا بڑا مقام ہے۔ دوسری طرف اسی انسان کے بارے میں فرماتا ہے:

كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ۔ (4)

یعنی: ''یہ جانوروں کی مثل ہے بلکہ ان سے بھی بدتر ہے۔''

جانوروں میں کتا اور خنزیر بھی ہیں جو کہ نجس العین ہیں۔ یہ انسان ان سے بھی بدتر ہے۔ ایک طرف یہی انسان اتنا بلند ہو جاتا ہے کہ خدا کے قریب پہنچ جاتا ہے۔

''وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ O ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّىٰ O فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ (5)

یعنی: ''وہ بلند ترین مقام پر پہنچا پھر اتنا قریب ہوا کہ خدا اور اس کے درمیان ایک کمان سے بھی کم کا فاصلہ رہ گیا۔''

دوسری طرف اتنا پست ہو جاتا ہے کہ خدا فرماتا ہے:

''ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ'' (6)

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں دو پہلو ہیں۔ مثبت بھی اور منفی بھی۔ عقل بھی ہے اور جذبات بھی۔ انتہائی کمال تک بھی پہنچ جاتا ہے اور انتہائی پستی میں بھی گر جاتا ہے۔ یہ کونسی چیز ہے جو اسے اتنا بلند بھی کر دیتی ہے اور اتنا پست بھی۔ یہ اعمال ہیں جو انسان کو کمال بھی عطا کرتے ہیں اور پستی میں بھی گرا دیتے ہیں۔ انہی اعمال کی بنا پر خدا کے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ اس کا مظہر بن جاتا ہے اور وہ فرماتے لگتا ہے کہ اے بندے مجھے تجھ سے پیار ہو گیا ہے۔

'' لا یزال العبد یتقرب الی بالنوافل والعبادات حتی احبه فاذا احببته کنت سمعه الذی یسمع به و بصره الذی یبصر به ویده التی یبطش بها و رجله التی یمشی به'' (7)

یعنی: '' بندہ نیکیوں کے ذریعے میرے قریب ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ جب میں اس سے محبت کرنے لگتا تو اس کی قوت سماع بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اس کی بصارت بن جاتا ہو، جس سے وہ دیکھتا ہے۔ اور اس کے ہاتھ اور پائوں میں میری طاقت آجاتی ہے۔''

پس نیک اعمال خدا کے قرب کا باعث بنتے ہیں اور برے اعمال اس سے دوری کا موجب بنتے ہیں۔ کچھ گناہ ایسے ہوتے ہیں کہ عام طور پر ان کی پروا نہیں کی جاتی حالانکہ وہ گناہان کبیرہ میں سے شمار ہوتے ہیں اور ان کی بڑی سخت سزا ہوتی ہے۔ انہی میں سے ایک گناہ غیبت بھی ہے۔

غیبت کی تعریف

یعنی کسی کی غیر موجودگی میں اس کی وہ برائی بیان کرنا جو اس میں پائی جاتی ہو۔

غیبت کی سزا

غیبت کرنا ایسے ہی ہے جیسے مردہ بھائی کا گوشت کھانا۔ سورہ حجرات میں خدا فرماتا ہے:

"یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَیُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ یَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ" (8)

یعنی: "اے صاحبان ایمان گمان سے بچو کیونکہ بعض گمان گناہ ہیں اور نہ ہی کسی کی ٹوہ میں رہو اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ یقیناً تم اسے ناپسند کروگے۔ تقوی الٰہی اختیار کرو۔ بے شک خدا توبہ قبول کرنے والا بھی ہے اور رحم کرنے والا بھی۔"

ایک دن رسول خدا (ص) نے لوگوں کو روزہ رکھنے کے لیے کہا اور فرمایا میری اجازت کے بغیر کوئی بھی افطار نہ کرے۔ جب وقت افطار آیا تو صحابہ آئے۔ اجازت لی اور روزہ افطار کرنے لگے ایک صحابی نے کہا یا رسول اللہ (ص) میری بیٹیوں نے بھی روزہ رکھا ہے اور اب وہ اجازت افطار چاہتی ہیں۔ آپ اجازت دیں تاکہ وہ بھی افطار کرلیں۔ آپ نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ جب اس نے تیسری دفعہ تکرار کیا تو فرمایا انھوں نے روزہ نہیں رکھا۔ سارا دن تو غیبت کرکے گوشت کھاتی رہی ہیں اور تم کہہ رہے ہو کہ وہ روزے سے ہیں۔ جاؤ ان سے کہو کہ قے کریں۔ وہ گھر گیا اور تمام واقعہ کہہ سنایا اور انھیں قے کرنے کے لیے کہا۔ جب انھوں نے قے کی تو گوشت کے ٹکڑے ان کے منہ سے نکلے۔ واپس آکر رسول خدا (ص) کو اطلاع دی تو فرمایا۔ مجھے اس ذات اقدس کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں محمد (ص) کی جان ہے اگر گوشت کے یہ ٹکڑے ان کے پیٹ میں رہتے تو پھر آتش جہنم انھیں کھاتی۔ (9)

رسول خدا (ص) فرماتے ہیں:

" من اکل لحم اخیه فی الدینا قرب الیه یوم القیامة فیقال له کله میتاً کما اکلته حیا فیاکله ویکلح ویضج۔ (10)

یعنی: " جو دنیا میں اپنے بھائی کا گوشت کھاتا ہے تو قیامت کے دن اس کے سامنے مردہ لایا جائے گا اور اسے کہا جائے گا اس مردہ کو کھاؤ جس طرح اسے زندگی میں کھایا تھا۔ تکلیف کے مارے تیوری چڑھائے گا اور نالہ وفریاد کرے گا لیکن اسے کھانا پڑے گا۔"

نیز رسول خدا (ص) فرماتے ہیں: جو کسی کے برے عمل پر مطلع ہو جائے پھر وہ اسے دوسرے لوگوں تک پہنچادے تو وہ بھی اس گناہ کے کرنے والے کی مثل ہے۔ (11)

غیبت کا نقصان

۱۔ غیبت کرنے کی وجہ سے اعمال قبول نہیں ہوتے۔ رسول خدا (ص) فرماتے ہیں: جو کسی مسلمان کی غیبت کرتا ہے تو چالیس دن تک اس کی نماز اور روزہ قبول نہیں ہوتے۔ مگر یہ کہ جس کی غیبت کی ہے وہ معاف کردے۔ (12)

۲۔ نیکیوں کو ختم کر دیتی ہے۔ امام صادق (ع) فرماتے ہیں: مسلمان کے لیے غیبت کرنا حرام ہے۔ غیبت نیکیوں کو ایسے کھا جاتی ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو۔ (13)

قیامت کے دن ایک شخص کو لایا جائے گا اور اس کے ہاتھ میں اس کا نامہ اعمال دیا جائے گا۔ وہ اسے دیکھے گا تو اس میں اسے اپنے نیک اعمال نظر نہیں آئیں گے وہ کہے گا پروردگار یہ میرا نامہ اعمال نہیں ہے کیونکہ اس میں مجھے اپنے کچھ اعمال نظر نہیں آرہے۔ شاید بھول کر مجھے دے دیا گیا ہے۔ اس وقت آواز آئے گی۔ تیرا رب بھولنے والا نہیں ہے تیری نیکیاں ان افراد کی طرف منتقل ہو گئی ہیں جن کی تو نے غیبت کی تھی۔ دوسرے شخص کو لایا جائے گا۔ اسے نامہ اعمال دیا جائے گا۔ وہ کہے گا یہ میرے عمل تو نہیں ہیں۔ اسے کہا جائے گا یہ فلاں شخص کی نیکیاں ہیں جو تیری طرف منتقل کر دی گئی ہیں کیونکہ اس نے تیری غیبت کی تھی۔ (14)

اقسام غیبت

غیبت دو طرح کی ہو سکتی ہے، زبانی اور عملی۔ زبانی غیبت یہ ہے کہ زبان سے کسی کی برائی کی جائے اور عملی غیبت یہ ہے کہ اشارہ سے کسی کی برائی کی طرف متوجہ کرنا۔ ہاتھ کا اشارہ ہو یا آنکھ کا۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ ایک عورت مجھ سے ملنے آئی۔ اس کا قد چھوٹا تھا۔ جب وہ چلی گئی تو میں نے ہاتھ کے اشارہ سے کہا کہ اس کا قد چھوٹا تھا۔ رسول خدا (ص) نے فرمایا تو نے اس کی غیبت کی ہے۔

جس طرح غیبت کرنے کا گناہ ہے اسی طرح اس کے سننے کا بھی گناہ ہے۔ رسول خدا (ص) فرماتے ہیں کہ جس کے پاس اس کے دینی بھائی کی غیبت کی جائے اور وہ اس کی حمایت پر قادر بھی ہو۔ اس کے باوجود وہ اس کی حمایت نہ کرے تو خدا اسے دنیا و آخرت میں ذلیل کر دے گا اور جو حمایت کرے گا خدا دنیا و آخرت میں اسے سرخرو کر دے گا۔ (15)

اسی طرح ایک اور مقام پر فرماتے ہیں جو غیبت کرنے والے کو روک دیتا ہے تو خدا دنیا و آخرت کی ہزار مصیبتیں اس سے دور کر دیتا ہے۔

غیبت کا کفارہ

غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ جس کی غیبت کی ہے اس سے معافی مانگے ہو سکتا ہے کہ شرمندگی ہو لیکن یہ شرمندگی آخرت کی شرمندگی اور عذاب سے بہتر ہے اور اگر وہ شخص مر چکا ہے یا معافی مانگنا مشکل ہے۔ لڑائی جھگڑے کا خوف ہے یا تعلقات خراب ہونے کا ڈر ہے تو پھر جب بھی اس کی یاد آئے تو اس کے لیے مغفرت کی دعا کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو ممکن ہے کرنے والا بخشا جائے اور غیبت کرنے والا پکڑا جائے۔

امام صادق (ع) فرماتے ہیں کہ جو کسی مومن کے کسی گناہ پر مطلع ہو جائے اور اسے لوگوں کے درمیان پھیلا دے اور اسے نہ چھپائے۔ اس کے لیے استغفار نہ کرے تو خدا کے نزدیک وہ اس گناہ کرنے والے کی مثل ہے اور اس گناہ کی سزا کا مستحق ہے جو اس نے دوسروں تک پھیلایا ہے اور اس پھیلانے کی وجہ سے ممکن ہے گناہ کرنے والا بخشا جائے کیونکہ دنیا میں اس کی اہانت ہو چکی ہے لہٰذا قیامت میں خدا اسے چھپا دے گا اور اسے سزا نہیں دے گا۔ (16)

مستثنیات غیبت

بعض مقامات پر غیبت کرنا جائز ہے بلکہ بعض اوقات واجب ہو جاتا ہے۔

ا۔ طلب انصاف کے لیے۔ مثلاً اگر کسی نے کوئی حق غصب کیا ہے اب وہ قاضی یا کسی فیصلہ کرنے والے کے سامنے حق غصب کرنے والے کی برائی کرتا ہے تو یہ جائز ہے یا مثلاً کسی نے قرض لیا ہے اب ہونے کے باوجود واپس نہیں کرتا تو قرض دینے والا اس کی غیبت کر سکتا ہے۔

۲۔ برائیوں کی روک تھام کے لیے۔ مثلاً کسی نے اپنے گھر کو فحاشی کا اڈا بنا رکھا ہے۔ یہ اکیلا اسے نہیں روک سکتا۔ یہ اس کی غیبت کرتا ہے تاکہ محلے میں بات پھیل جائے اور سب لوگ مل کر اسے روکنے کے لیے اقدام کریں۔ یا مثلاً کوئی نیک شخص برے شخص سے دوستی کر رہا ہے تو اس کے سامنے غیبت کرنا تاکہ وہ اس سے دوستی نہ کرے۔

۳۔ شرعی مسئلہ پوچھنے کے لیے۔ اگر کوئی کسی کے ساتھ کوئی کاروبار کرنا چاہتا ہے یا رشتہ جوڑنا چاہتا ہے اور وہ کسی سے اس کے بارے پوچھتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ سب کچھ سچ سچ بتائے۔ اب اگر وہ اس کے عیوب چھپائے گا تو پھر گناہ گار ہے کیونکہ اس نے مشورہ مانگنے والے کے ساتھ خیانت کی ہے۔

۴۔ بدعتی انسان کی غیبت کرنا جائز ہے۔

۵۔ کھلے عام گناہ کرنے والے کی غیبت کرنا بھی جائز ہے۔

*****

حوالہ جات

1۔ سورہ بقرہ: ۳۰
2۔ سورہ مومنون: ۱۴
3۔ سورہ بنی اسرائیل: ۷۰
4۔ سورہ اعراف: ۱۷۹
5۔ سورۂ نجم: ۷ تا ۹
6۔ سورہ التین: ۵
7۔ ابن ابی جمہور عوالی اللالی، ج ۲، ص ۱۰۴، ح ۱۵۲
8۔ سورۂ حجرات: ۱۲
9۔ مصطفیٰ نورانی، محرمات و کیفر آنھا در دین، ص ۹۴
10۔ طبرانی، المعجم الاوسط، ج ۲، ص ۱۸۲
11۔ صدوق، الامالی، ص ۵۱۶، مجلس ۶۶، ح ۷۰۷
12۔ مجلسی، بحار الانوار، ج ۷۲، ص ۲۵۸
13۔ شہید ثانی، وسائل، ص ۲۸۷
14۔ مجلسی، بحار الانوار، ج ۷۲، ص ۲۵۹
15۔ طبری، مکارم الاخلاق، ص ۴۷۰
16۔ مفید، الاختصاص، ص ۳۲

The permanence of Divine Guidance and its Medium

Dr.Sheikh Muhammad Hasnain

(Director NMT; Research Scholar, Islamabad)

Allah almighty is the creator and guide of this universe. The Divine guidance is an eternal process for all objects of the universe. The first argument in favour of permanence of this guidance is attributed to one name of Allah i.e. Al-Qayyum. Every object of universe needs this guidance all the time to reach its final destiny as decided by the creator. The second argument to the permanence of this guidance from the creator is the permanence of demand of this guidance by whole universe. The Holy Quran guides the mankind to continuously seek guidance from Allah which also proves the continuity and permanence of this guidance process.

The important question in this regard is whether this guidance is direct or via some medium. Different viewpoints can be adopted in reply to this question. One view can be total refusal of any such medium. Another view can be to limit the guidance to only one or two mediumquran & sunnah. But the real truth here is that if divine guidance is permanent, the existence of its medium is also supposed to be permanent. If this is true then we must seek & get divine guience throw its propel medium.

By virtue of several verses of Quran, this conveyer of guidance to humanity is supposed to be selected by the . God himself only. Such a personality shall be free of all errors, omissions and ignorance. The only manifestation of such a personality who is both selected by God and is innocent also is named as "Imam" in Shia shool of Islamic Thought .

The reality of Divine Justice

Saqib Akbar

(Chairman Al-Basira, Research Scholar, Islamabad)

The terms of 'Adl' and 'Qist' have appeared side by side in the Holy Quran at several places. Adl means maintaining a balance, fees or financial compensation. It is also used in the meaning of sacrifice. It is also used in a totally opposite meaning of 'to abandon' and 'to leave away'. The word 'Insaaf' in urdu and the word 'justice' in English are also used in equivalent meanings. All this implies that the word 'Adl' has different meanings .

We need to clarify the term 'Adl' before answering the next question: "What is the meaning of Allah is 'Adil'(The Just)?" The different meanings of 'Adl' are: the balance in Universe and all of its things, other is equality; one meaning is giving every person his right .

The last meaning is opposite to term injustice. However, the balance in the creation of universe is a reality and this balance is there in creations of Allah and in within human beings. The meaning of 'Adl' is even broader. According to a religious scholar Ustad Mutahiri, the meaning of 'Adl by Allah' is to help all creations to reach the stage of ultimate perfection each individual can attain by virtue of its ability to absorb his deserved divine spirituality from the Allah .

An Analysis about declaring a Muslim as a Non-Muslim in Ahl-e-Bait's view

Syed Rameez-ul-Hassan Mosvi

(Editor Noor-e-Marfat; Research Scholar, Islamabad)

The question of Takfeer (declaring a Muslim to be a non-Muslim) has been a conflicting issue since long amongst the Muslim factions. Some groups connected to the rulers have tried to exclude particular faction totally from boundaries of Islam. However, this practice is not limited against Imamians alone and some Sunni Muslim schools of thought are also being targeted nowadays .

Takfeer is a sensitive issue and a Muslim cannot be dismissed from Islam just without a solid evidence of one of these three reasons: refusal to believe in Allah or the Holy Prophet and refusal to accept any other basic conditions of Islam. However, labeling someone as a non-Muslim after he has declared himself as a Muslim requires a proof of his such an act and deed. It has serious implications in Islamic jurisprudence as the muslim guilty of abandoning Islam has to be punished with death. Therefore, only unbiased top Muslim scholars hold this right to declare someone guilty of abandoning Islam.

Hazrat Imam Jafar said that Islam is the name of declaring about oneness of Allah and believing in the Holy Prophet. Islam protects the life of a Muslim and purifies his marriage. Sheikh Sadooq also says the same. According to Imamians it is forbidden to declare any Muslim as a non-muslim who does not accepts the Imamat of Hazrat Ali. However, idol worshippers, Nasbis, kharjis and those abusing Allah or the prophet are to be declared as non-muslims.

The idea of submission to the ruler and the viewpoint of Imam Hussain

Dr.Abbas Haider Zaidi Dr. Zahid Ali Zahidi

((Pak Studies Department KH, Karachi Islamic Studies Department KH, Karachi))

In every era, all rulers have taken support of religion in order to strengthen their grip on their public and presented themselves as someone connected with supernatural forces; whereas, public who is ignorant of reality has also honored these rulers with their full trust without even weighing rulers' good and bad deeds. Same has happened in the time period of Yazid. Despite the fact that Yazid was a evil doer, a drinker, playing with dogs and monkeys, and fond of singing and playing music ; a vast majority of Muslims not only accepted him as their ruler but they also considered that it was their religious obligation to obey yazid.

This happened because Ummayads collected a bunch of scholars who would modify the interpretation of Quranic verses and sayings of the prophet in order to strengthen the belief that it was a religious obligation of Muslims to obey the tyrant rulers of Ummayads. Consequently, those Muslims fighting against Imam Hussain on the command of Yazid; considered their this act just according to Islam.

Unfortunately, today also a group of Muslim scholars believes in and make others believe (thru verses of Quran and sayings of the Holy Prophet) that it is a religious obligation of all Muslims to obey all commands of their rulers in all times even if he is tyrant.Simalarly there is a debate between some scholars about the quranic concept of Ulil-Amr. One group thinks that all Muslim rulers of all times and places are Ulil-Amr and any movement against them is a rebellion even if they are autocrats and oppressors.

Imam Hussain rejected this very idea of unconditional obeying of the ruler of time by standing against Yazid. He made it clear once for all times that it is not appropriate and according to Islam to follow a ruler who himself does not follow the Holy book, who is an oppressor, does not follow divine will and does not surrender himself to God. Standing against such a ruler is not a rebel but is in fact the true Jihad.

Imam Hussain's Exalted Personality Traits.

Syed Hasnain Abbas Gardezi

(Chairman Noor-ul-huda Trust, Principal Jamia-tul-Raza, Islamabad)

The life of Imam Hussain can be divided into four time periods. The initial life was under the training of the Holy Prophet, the second period under the supervision of his father Hazrat Ali, the third period consists of Imamat of his brother Imam Hassan and his own Imamat. The last time period is very short but very important; the time in which the incident of Karbala took place. This incident is the indicator of the spiritual heights of his personality and behaviour. The family background of Imam Hussain is very elevated and has no comparison. Some events from his life are narrated here about his 'Generosity' which he inherited from the Holy Prophet .

He always took care of self respect of others while giving alms. He is also known for patience. Humbleness was one of his excellent traits. He not only overlooked servants' faults but also freed them often. He would reply enemy's disrespectful behaviour with his soft behaviour. His bravery was also exemplary especially in the Kabala. He clarified for all times to come the real meaning of life and death. History is witness to the fact that once Imam Hussain turned his face to his enemies, after the death of his all companions, he drew his sword and became Allah's wrath on a large army.

Economic Justice

In The Light of Nahj-ul-Balagha

Roshin Ali

(Assistant Professor, Model Collegas Wing, Islamabad)

'Iqtesad' (Economics) means following the midway. It means discovering the means of creation of wealth and its applicable uses. Similarly 'Adl' (Justice) means to distribute equally, giving everyone his right, placing a thing at its place etc. If we have a look at the economic system as established by Hazrat Ali(A.S.), we find that the system proposed by him was based on freedom of trade and business, means of production were public property, and every person was free to use any of different economic means. Every person should be able to fulfill his basic needs.

The public money, 'Khums', alms (sadqaat) and Khiraaj were the pillars of Islamic economy. 'Hoarding' was considered harmful for both country and the nation. Government was to act against hoarders. It was necessary to reform Zakaat (Islamic Tax) payers. It was necessary for the collectors to collect zakat as per will of its payers. He distributed a city's collected tax amongst the needy of the same city as per Sunnah .

Similarly, the orphans and the old have rights in Bait-ul-Maal. The governors were directed to enact justice including economic justice. The 'khiraaj' (tax from nom-Muslims) collectors were ordered to soften the conditions in case of complaints. Muslim rulers were responsible for collection and supervision of Zakaat. The money looted from Bait-ul-Maal was returned. He warned the governors of any dishonesty with Bait-ul-maal .

Backbiting is a major Sin

Syed Muzammil Hussain Naqvi

(Director Albiserah Research Scholar, Islamabad)

Islam has given a lot of importance to human beings. God has made man his caliph on the earth. Allah has perfected the man and conquered the universe for him. There are two aspects of man: positive and negative, logic and emotions, elevation and fall. these are the human deeds infact that make the man rise or fall? Good deeds are the source of man's closure to God while sins are the source of his distance from God .

Some sins are commonly considered to be minor but they are in fact major sins in the eyes of Allah. Backbiting is one such evil which means talking against someone in his absence. As per Quran, backbiting is equivalent to eating meat of a dead brother.Backbiting is of two types i.e. by words and by actions. In any case, the backbiter could only be forgiven if he begs pardon from the concerned person. The embarrassment will be temporary but it will wash away this sin. However, under certain circumstances backbiting is allowed in Islam e.g., for seeking justice, for stopping the evil, for asking a question in Shariah.

سہ ماہی **نور معرفت**

ممبر شپ فارم

نام: _____ تعلیم: _____

پیشہ: _____ فون نمبر: _____

پتہ: _____

_____

E-mail: _____

براہ کرم سال _____ کے لئے نور معرفت میرے نام جاری کر دیجئے۔ شکریہ دستخط خریدار: _____

دفتری استعمال کے لئے

برادر/خواہر _____ کی ممبر شپ برائے سال _____ کی درخواست منظور کرتے ہوئے رجسٹریشن نمبر جاری کر دیا گیا ہے متعلقہ ممبر کو مجلّہ باقاعدگی سے ارسال کیا جائے گا۔

رجسٹریشن نمبر: _____ تاریخ اجراء: _____ ممبر ساز: _____

نوٹ: مجلّہ کا 2015ء کے لئے زرِ سالانہ مبلغ:/500 روپے اور فی شمارہ:/130 روپے ہے۔

خط وکتابت کا پتہ:

سہ ماہی نور معرفت/نوری الہدیٰ مرکز تحقیقات/نور الہدیٰ ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

سادات کالونی/بارہ کہو اسلام آباد/فون: 051-2231937

www.nht.org.pk, www.nmt.org.pk

E-mail:noor.marfat@gmail.com

ISSN 2221-1659

Quarterly

Religious Research Journal

Noor-e-Marfat

السلام علیک یا اباعبداللہ الحسین علیہ السلام

حدیثِ عشق دو باب است کربلا و دمشق — یکے حسینؑ رقم کردہ دیگرے زینبؑ

دربارِ یزید میں جناب زینبؑ بنت علیؑ کے فکر انگیز خطبہ سے اقتباس

اے یزید!

تیرے پاس مکر و فریب کا جتنا ذخیرہ ہے اُسے جی کھول کر کام میں لے آ، ہر طرح کے جتن کر کے دیکھ لے، اپنی جدوجہد کو مزید تیز کر دے اور اپنی حسرتیں نکال لے مگر یاد رکھ اس کے باوجود نہ تو دنیا سے ہمارا نام مٹا سکتا ہے نہ ہماری شہرت کو کم کر سکتا ہے نہ ہماری فکر کو پھیلنے سے روک سکتا ہے۔

ہاں!! مٹنے والا اور فنا ہونے والا تو ہے۔ (مقتل مطہر)

"نمت" (نور الہدیٰ مرکز تحقیقات)

نور الہدیٰ ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، سادات کالونی، بارہ کہو، اسلام آباد www.nmt.org.pk